جلد (۱۱) عدد (۳)
رمضان ۱۳۵۶ھ

رجسٹر نمبر آصفیہ ۱۲۰
رجسٹر نمبر ایم ۲۹۵۰

۷۸۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علومِ قرآنی و حقائقِ فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ (صمہ)
قیمت فی پرچہ (۸/)

الجہاد فی الاسلام

تالیف

سید ابوالاعلیٰ مودودی

مختصر فہرست مضامین حسب ذیل ہے۔

اسلامی جہاد کی حقیقت | اس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی تعلیم جہاد کن اہم حقائق پر مبنی ہے اور نظام تمدن میں روح جہاد کا کیا مرتبہ ہے۔

مدافعانہ جنگ | وہ اغراض جن کے لیے قرآن نے دفاعی جنگ کا حکم دیا ہے۔

مصلحانہ جنگ | اصلاحی جنگ کے اصول و مقاصد کی تشریح اور ان اعتراضات کا مدلل جواب جو اس نوع کی جنگ پر کیے جاتے ہیں۔

اشاعت اسلام اور تلوار | دعوت و تبلیغ کے متعلق اصول تعلیم اسلامی کی تشریح اور اس کی تحقیق کہ اشاعت اسلام میں تلوار کا کیا حصہ ہے۔

قوانین جنگ | اسلام سے قبل کے وحشیانہ طریقہائے جنگ اور ان میں اسلام کی اصلاحات۔

جنگ دیگر مذاہب میں | جنگ کے متعلق ہندو مذہب، بودھ مت، یہودیت اور عیسائیت کی تعلیمات کی تشریح اور اسلام سے ان کا مقابلہ

جنگ اور تہذیب جدید | بین الاقوامی قانون جنگ کی تفصیل اور اسلامی قانون جنگ سے اس کا مقابلہ۔

صفحات ۔۔۔۵ صفحے قیمت مجلد ([illegible]) انگریزی ([illegible]) سکہ عثمانیہ غیر مجلد ([illegible]) انگریزی ([illegible]) سکہ عثمانیہ

دفتر ترجمان القرآن۔ (حیدرآباد دکن)

فہرست مضامین

ماہ رمضان المبارک ۱۳۵۶ھ جلد ۱۱ عدد ۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

پنڈت جواہر لال کو یہ فخر حاصل ہے کہ انہوں نے ہندوستان کے بین الاقوامی مسئلہ کا ایک نیا حل دریافت کیا ہے جس کی گہرائیوں تک ان سے پہلے کے ہندوستانی سیاست دانوں کی نظر نہ پہنچی تھی، یا اگر پہنچی تھی تو ان میں ایسا انقلابی حل پیش کرنے کی جراَت نہ تھی۔ اس حل کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے اُن نظریات کا تجزیہ کرنا ضروری ہے جن کو پنڈت جی نے بطور اصول موضوعہ کے تسلیم کرلیا ہے اور پھر انہی پر اُس پالیسی کی بنیاد رکھی ہے جسے وہ اس مسئلہ کا صحیح حل سمجھتے ہیں۔

میں ان نظریات کو ترتیب وار بیان کرونگا، تاکہ اِس پالیسی کی پیدائش اور اس کے ارتقاء کا پورا نقشہ آپ کے سامنے آجائے۔

پنڈت جی کے تصور کی ابتدا یہاں سے ہوتی ہے کہ وہ ہندوستان کی آبادی کو ایک قوم فرض کرتے ہیں۔ تاریخ یورپ اور سیاسیات یورپ کے مطالعہ سے ان کے ذہن میں قومیت کا صرف ایک ہی تصور پیدا ہوا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ایک جغرافی رقبہ کی تمام آبادی ایک قوم ہے اور اس کو ایک ہی قوم ہونا چاہیے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ فرانس ایک ملک اور ایک قوم ہے۔ جرمنی ایک ملک اور ایک قوم ہے۔ اٹلی، انگلستان، ہسپانیہ وغیرہ ایک ایک ملک اور ایک ایک قوم ہیں۔ اس مشاہدہ کے دوران میں ان کی نظر اس حقیقت کی طرف نہیں جاتی کہ ان میں سے ہر ملک کے باشندے ایک اسپرٹ، ایک قسم کے تمدن اور کم از کم قریبی دور کی

حد تک ایک قسم کی تاریخی روایات کے حامل ہیں، اور وہ تمام عناصر ترکیبی جن سے ایک قومیت وجود میں آتی ہے، ان کے درمیان مشترک ہیں یا واقعات کی رفتار نے ان کو مشترک بنا دیا ہے، اور اس اشتراک ہی نے ان کے اندر یہ ہم آہنگی اور یگانگت پیدا کی ہے۔ ان سب حقیقتوں کو نظر انداز کر کے وہ ایک نہایت سطح بین آدمی کی طرح یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ان سب ممالک میں قومیت کی اساس ارشتہ، وطنیت کا اشتراک ہے، اور اسی طرح سے ہر خاک وطن کی پیداوار کو ایک ہی قوم ہونا چاہیے۔

یہی تصور ہے جس کے تحت ان کے قلم سے یہ الفاظ نکلے ہیں۔

"ہندوستان میں مسلم قومیت پر زور دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ بس یہی کہ ایک قوم کے اندر ایک دوسری قوم موجود ہے جو یکجا نہیں ہے، منتشر ہے، مبہم ہے اور غیر متعین ہے۔ اب سیاسی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو یہ تخیل بالکل لغو معلوم ہوتا ہے اور معاشی نقطۂ نظر سے یہ بہت دور از کار ہے اور بدقت قابل توجہ کہا جا سکتا ہے۔۔۔۔۔۔۔ مسلم قومیت کا ذکر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں کوئی قوم ہی نہیں، بس مذہبی اخوت کا رشتہ ہی ایک چیز ہے، اس لیے جدید مفہوم میں کوئی قومیت نشو نما نہ پا سکے"۔ (میری کہانی۔ جلد دوم۔ صفحہ ۳۳۱۔ مکتبہ جامعہ دہلی)۔

اس عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت جی کے ذہن میں ہندوستانی قومیت کا تصور کیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ مطالعہ اور فہم کا قصور ہو، یا ہندوستان کو ایک قوم دیکھنے کی آرزو نے ان کے ذہن کو روشن ترین حقائق کے ادراک سے عاجز کر دیا ہو۔ بہرحال یہ واقعہ ہے کہ وہ نیشنلزم اور کمیونلزم کے الفاظ کو بالکل حقیقی معنوں میں لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہندوستان میں ایک قوم رہتی ہے، اور یہ مسلمان، ہندو، عیسائی وغیرہ اس کے فرقے ہیں۔ اسی بنا پر وہ ہندوستان کی ان جماعتوں کے اختلافات کو "فرقہ وارانہ" مسئلے سے تعبیر کرتے ہیں، اور یہ بنیادی حقیقت ان کے ذہن کی گرفت میں آتی ہی نہیں کہ یہ مسئلہ دراصل فرقہ وارانہ نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے ــــــ آپ چاہیں تو اسے ایک بدقسمتی کہیے اور بہت ہی ناگوار چیز سمجھیے، مگر ہے

یہ حقیقت اور اس حقیقت کو نظر انداز کرنے میں پنڈت جی تنہا نہیں ہیں، بلکہ تمام "قوم پرست" ان کے شریک حال ہیں۔

تصورِ قومیت کے بعد دوسرا تصور جو صاحب موصوف پر حاوی ہے، وہ کارل مارکس کا فلسفہ تاریخ ہے۔ یہاں اس فلسفہ کی تشریح کا موقع نہیں مختصر یہ ہے کہ جس طرح کسی بھوکے سے پوچھا گیا تھا کہ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں تو اس نے کہا تھا کہ چار روٹیاں، اسی طرح معاشی مصائب کے مارے ہوئے اس فلسفی نے بھی دنیا کے تمام مسائل کا مرکز و محور صرف روٹی کے مسئلہ کو قرار دیا ہے۔ تاریخ کے تمام انقلابات میں اس کو معاشی طلب یا بھوک کے سوا کوئی قابل توجہ عامل (Factor) نظر نہیں آتا۔ اس کے نزدیک جواہر لال نہرو کے الفاظ میں "دنیا کی ساری تاریخ کا خلاصہ یہ ہے کہ معاشی مفاد ہی وہ قوت ہے جو جماعتوں اور طبقوں کے سیاسی خیالات کی تشکیل کرتی ہے" (ص ۴۵)۔ اگرچہ پنڈت جی بقول خود کسی اذعانی عقیدے (Dogma) کے قائل نہیں ہیں، مگر مارکس کی اس تعبیر تاریخ کو انہوں نے وحی آسمانی کی طرح قبول کیا ہے، اور اس کے متعلق وہ فرماتے ہیں کہ "اب میرے نزدیک تاریخ کے معنی ہی بدل گئے۔ مارکس کی تعبیر نے اسے کہیں زیادہ روشن اور واضح کر دیا"۔ (ص ۱۴۱)۔

اپنے تصور قومیت کے ساتھ اس مارکسی فلسفہ کو ملا کر پنڈت جی یہ نظریہ قائم کرتے ہیں کہ اول تو ہندوستان کی تمام آبادی ایک قوم ہے۔ پھر اس قوم میں اگر کوئی حقیقی امتیاز و اختلاف ہو سکتا ہے تو وہ صرف معاشی بنیادوں پر ہو سکتا ہے۔ یہ ہندو اور مسلم اور عیسائی، یعنی مذہب کی بنیاد پر جو اختلافات ہیں، یہ کسی طرح معقول نہیں ہیں۔ اختلاف کی فطری اور معقول بنیاد یہ ہے کہ قوم کے اندر جن کے پاس ایک روٹی ہو وہ سب ایک گروہ ہوں، اور جن کے پاس دو روٹیاں ہوں وہ دوسرا گروہ ہوں، وھلم جرا۔ پھر اگر ان کو لڑنا ہو تو روٹیوں پر لڑیں۔ بلکہ "اگر" "کیا معنی" ان کو اسی چیز پر لڑنا چاہیے۔

اسی نظریہ کی بنیاد پر ہندوستان جدید کا یہ لیڈر کہتا ہے ۔

"معاشی نقطۂ نظر سے یہ (یعنی مسلم قومیت کا تخیل) بہت دور از کار ہے اور بدقت قابل توجہ کہا جا سکتا ہے"۔ (ص ۳۳۱)۔

" ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو مسلمانوں کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملتوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں ہے آج جماعتوں اور ملتوں کی بنیاد اقتصادی فوائد پر رکھی جاتی ہے"۔ (جواہر لال کا خطبۂ صدارت آل انڈیا نیشنل کنونشن منعقدہ مارچ ۱۹۳۷ء)

اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ جب سارے ہندوستان کی آبادی ایک قوم ہے، اور اس قوم کے درمیان فرقے اور گروہ بننے کی وجہ محض معاشی اغراض ہی ہو سکتی ہیں، تو پھر یہ ہندو، مسلم اور دوسرے فرقے کہاں سے پیدا ہو گئے؟ یہ معاملہ کیا ہے کہ غیر معاشی چیزوں نے ہندوؤں کو ایک "فرقہ" اور مسلمانوں کو دوسرا "فرقہ" بنا دیا اور ان کے درمیان غیر معاشی وجوہ سے اختلافات پیدا کر دیئے؟ یہاں موقع تھا کہ پنڈت جی اس نظریہ پر نظر ثانی کرتے جسے انہوں نے مارکس کی "وحی" سے اخذ کیا ہے، اور اذعانی عقیدے کے طور پر تسلیم کر لیا ہے۔ ان کے سامنے واقعات کی دنیا میں ایک کھلی ہوئی حقیقت موجود تھی جو شہادت دے رہی تھی کہ انسان کے جسم میں صرف معدہ ہی ایک عضو رئیس نہیں ہے، صرف بھوک ہی وہ چیز نہیں ہے جو اس کی ذہنیت اور اس کے خیالات کی تشکیل کرتی ہو، صرف معاشی عامل (Factor) ہی ایک عامل نہیں ہے جو انسانوں کو قوموں اور گروہوں کی شکل میں مجتمع کرتا اور ان کے درمیان اختلافات پیدا کرتا ہو مگر انہوں نے تمام حقائق سے آنکھیں بند کر کے یہ رائے ـــــ عقلی و استدلالی نہیں بلکہ رجحانی و وجدانی رائے ـــــ قائم کر لی کہ یہ مذہبی تفریق ایک غیر فطری چیز ہے، اور اس مادۂ فاسد یعنی مذہب نے دخل انداز

ہو کر ہندوستانی قوم کو ایک صحیح بنیاد (یعنی روٹی کی بنیاد) کے بجائے ایک غلط بنیاد (یعنی طرزِ خیال اور طریقِ زندگی کی بنیاد) پر متفرق کر دیا ہے۔

اس تصور کے زیرِ اثر وہ جگہ جگہ مذہب پر یوں غصہ اتارتے ہیں:

"جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہتے ہیں اسے ہندوستان میں اور دوسری جگہ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہو گیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے اور اسے یکسر مٹا دینے کی آرزو تک ظاہر کی ہے۔ قریب قریب ہمیشہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اندھے یقین اور ترقی دشمنی کا بے دلیل عقیدت اور تعصب کا، توہم پرستی اور لوگوں سے بے جا فائدہ اٹھانے کا، قائم شدہ حقوق اور مستقل اغراض رکھنے والوں کے بقا کا حامی ہے" (ص ۱۶۱)۔

مذہب کے خلاف نفرت و غضب کا اظہار "ہندوستانی قوم" کے اس لیڈر نے اتنی کثرت کے ساتھ کیا ہے کہ تمام تحریروں کو نقل کرنا ایک طول عمل ہے۔ وہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں اس موقع پر جہاں ہندو اور مسلم کا نام آتا ہے، چیں بجبیں ہو کر کہتے ہیں کہ "مذہب کو بیچ میں کیوں لاتے ہو"۔ اس ارشاد سے ان کی مراد یہی ہوتی ہے کہ سیاسی، اجتماعی اور معاشی گروہوں میں مذہب کی بنیاد پر تفریق کرنا سرے سے غلط ہے۔ اس غلط بنیاد کو ڈھانا چاہیے، نہ کہ اس کو سامنے لا کر ایک قابلِ لحاظ چیز قرار دینا۔

ہندوستانی "قوم" میں فرقوں کے وجود اور ان کے باہمی اختلاف کی یہی ایک توجیہ ہمارے وطنی لیڈر کے پاس نہیں ہے۔ دوسری توجیہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ وہ اس کو برطانوی امپیریلزم کی پیدا کردہ چیز سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ انگریزوں کو اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے ہندوستانی قوم میں اختلاف پیدا کرنے کی ضرورت تھی اسی لیے اور صرف اسی لیے یہ اختلافات موجود ہیں۔

دیکھیے! یہاں نظر کا کتنا بڑا پھیر ہو گیا ہے۔ اگر پنڈت جی ذرا سمجھ سے کام لیتے تو یہ بات بآسانی

ان پر واضح ہو سکتی تھی کہ ہندوستان میں حقیقی اختلافات موجود تھے، انگریزوں نے ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور اس کوشش میں دو قسم کے لوگوں سے ان کو مدد ملی۔ ایک وہ خود غرض لوگ جو اپنے ذاتی فائدے کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نزاعات کو بھڑکاتے اور پیچیدہ تر بناتے ہیں جنہوں نے نہایت چالاکی سے اپنے آپ کو ان دونوں کا سرپرست اور نمائندہ بنا لیا ہے، نہ اس لیے کہ ان کے اختلافی مسائل کو اطمینان بخش طریقہ پر حل کریں، بلکہ محض اس لیے کہ ان اختلافات کو دائماً برقرار رکھ کر اپنے ذاتی مفاد اور برطانی سلطنت کے مفاد کی خدمت کرتے رہیں۔ دوسرے وہ بیوقوف لوگ جو ان اختلافات کی حقیقت کو سمجھنے اور انہیں دانشمندی کے ساتھ حل کرنے سے انکار کرتے ہیں اور اس طرح ان کے برقرار رکھنے میں مددگار بنتے ہیں۔ اگر پنڈت جی اس نظر سے اس مسئلے کو دیکھتے تو انہیں صحیح راستہ صاف نظر آ جاتا۔ لیکن وہ اپنے تخیل کی آنکھ سے اس کو دیکھتے ہیں، اور محض یہ دیکھ کر کہ ملک کے چند خود غرض اور ترقی دشمن لوگ انگریزی حکومت کیساتھ مل کر ہندو مسلمانوں کے اختلافی مسائل سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں، یہ نتیجہ نکال بیٹھے ہیں کہ درحقیقت ان اختلافی مسائل کی کوئی اصلیت نہیں ہے یہ صرف برطانوی امپیریلزم اور اس کے ہندوستانی ایجنٹوں کی پیدا کردہ چیز ہے اس بنا پر وہ جگہ جگہ "فرقہ وارانہ" مسئلے کے متعلق اس قسم کے خیالات کا اظہار فرماتے ہیں:

"ان کا (انگریزوں کا) ترپ کا پتہ فرقہ وارانہ مسئلہ تھا اور اسے انہوں نے خوب کھیلا" (صفحہ ۲۰)

"فرقہ پروری کے پردہ میں دراصل ترقی دشمنی نہاں ہے" (صفحہ ۲۳)

"اغراض کے اس ہجوم میں ... برطانوی ہند کے نمائندوں کی سرداری عموماً آغا خان کے حصہ میں آئی تھی"۔ (صفحہ ۲۱)

"اصل وقت فرقہ پروری نہیں ہے۔ اصل میں سیاسی ترقی دشمنی راہ میں حائل تھی اور فرقہ وارانہ مسائل کی آڑ میں کام کر رہی تھی"۔ (صفحہ ۲۴)

"حکومت روز بروز معاشرتی خرابیوں کی پشت پناہ بنتی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ

اس کا میل جول ہندوستان کی سب سے زیادہ رجعت پسند جماعتوں سے رہتا ہے۔ جوں جوں اس کی سیاسی مخالفت بڑھتی جاتی ہے اسے عجیب عجیب حمایتی ڈھونڈنے پڑتے ہیں۔ آج کل برطانوی حکومت کے سب سے بڑے حامی انتہائی فرقہ پرست، مذہبی رجعت پسند اور اصلاح و ترقی کے دشمن لوگ ہیں۔ مسلمانوں کی فرقہ پرست جماعتیں سیاسی، معاشی اور سماجی اعتبار سے انتہائی رجعت پسند ہیں۔ ہندو مہاسبھا بھی ان سے کچھ کم نہیں" (ص ۱۰۵)

"فرقہ پرست رہنماؤں کا اتحاد ان لوگوں کے ساتھ ہو گیا ہے جو ہندوستان اور انگلستان میں سب سے زیادہ رجعت پسند لوگ کہے جا سکتے ہیں اور یہ لوگ فی الحقیقت سیاسی اور سیاسی سے بھی زیادہ تمدنی اصلاح و ترقی کے دشمن ہیں۔ ان کے جملہ مطالبات میں سے ایک بھی عوام الناس کے فائدے کے لیے نہیں ہے" (ص ۱۱۳)۔

یہ اور ایسی ہی بہت سی تحریریں پنڈت جی کے انداز فکر پر صاف روشنی ڈالتی ہیں۔ ان کا انداز فکر یہ ہے کہ بیمار کا خود غرض طبیبوں اور عطاروں کے پھندے میں پھنس جانا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ دراصل بیمار ہی نہیں۔ ان کی رائے میں یہ تحقیق کرنے کی ضرورت ہی نہیں کہ آخر کیا چیز ہے جس کی وجہ سے ان مکار طبیبوں اور عطاروں کو اس بیمار پر ہاتھ صاف کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ سبب پر غور کرنے، اور غلط معالجوں کے پھندے سے نکال کر خود صحیح علاج کرنے کی زحمت کون اٹھائے۔ اس کا علاج بس یہی ہے کہ مرض کے وجود ہی سے انکار کر دیا جائے۔

ہندوستان کے بین الاقوامی مسئلہ کی یہ دو توجیہیں کرنے کے بعد پنڈت جی ان دونوں کے درمیان رشتہ جوڑتے ہیں۔ ان کا نظریہ اب ترقی کر کے یہ صورت اختیار کرتا ہے کہ مذہب نے "ہندوستانی قوم" کو فرقوں میں تقسیم کیا ہے، انگریزی امپیریلزم (سامراج) کے لیے یہ تقسیم مفید ہے، اور سرمایہ دار، زمیندار

اور تمام مستقل اغراض رکھنے والے طبقے سامراج کے ساتھ سازش کر کے اس تقسیم کو اپنی اور سامراج کی مشترک اغراض کے لیے استعمال کر رہے ہیں، لہذا مذہب اور سامراج، اور یہ خود غرض طبقے تینوں باہم قریبی رشتہ دار ہیں، تینوں قابل نفرت ہیں، اور تینوں کو مٹا دینا چاہیے۔ اسی نظریہ کے تحت یہ ارشادات جگہ جگہ پنڈت جی کے قلم سے نکلے ہیں :۔

"منظم مذہب بلا استثنا مستقل اغراض سے وابستہ ہو جاتا ہے اور یوں لازمی طور پر ایک ترقی دشمن قوت بن کر تغیر اور ترقی کی مخالفت کرتا ہے ...... حق ملکیت اور موجودہ نظام معاشرت کے متعلق اس کا رویہ یہی ہے" (ص ۶۹۔ ۱۶۷)۔

"جیل میں برطانوی افسر صرف دو قسم کی کتابیں پڑھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ مذہبی کتابیں اور ناول۔ یہ عجیب بات ہے کہ حکومت برطانیہ مذہب کی بڑی قدر دان ہے اور بڑی بے تعصبی کے ساتھ ہر قسم کے مذہب کی ہمت افزائی کرتی ہے" (ص ۱۱۵)۔

"مذہب امن کا وعظ کہتا ہے لیکن اس کے باوجود ایسے نظام کی تائید کرتا ہے جس کا دار و مدار ظلم پر ہے"۔ (ص ۲۹۶)۔

ان تینوں دشمنوں کی سازش سے ہندستان کو نجات دلانے اور اس ملک کو جنت نشان بنا دینے کی جو صورت پنڈت جی کے پیش نظر ہے وہ حسب ذیل ہے:۔

"ہر پھر کر ہم اسی چیز پر پہنچ جاتے ہیں جس کے سوا اس مسئلہ کا اور کوئی حل نہیں یعنی ایک اشتراکی نظام کا قیام، پہلے قومی دائرے میں اور پھر ساری دنیا میں۔ ایسا نظام جس میں دولت کی پیدائش اور تقسیم ریاست کی نگرانی میں مفاد عامہ کے لحاظ سے کی جائے۔ یہ انقلاب کس طریقہ سے ہونا چاہیے۔ یہ ایک جداگانہ سوال ہے لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ جس چیز میں ایک پوری قوم بلکہ کل نوع انسانی کی بھلائی ہو وہ محض اس وجہ سے نہیں روکی جا سکتی کہ کچھ لوگ جو موجودہ

نظام سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اس تغیر کے مخالف ہیں۔ اگر سیاسی یا تمدنی ادارے اس تبدیلی کی راہ میں حائل ہیں تو ان کو مٹا دینا چاہیئے"۔ (ص ۲۰-۴۱۹)

"جب تک ہمیں تھوڑی بہت سیاسی آزادی حاصل نہ ہو گی، ہمارے لیے قوم پرستی کا تخیل ہی سب سے بڑا محرک عمل رہے گا......۔ یہاں تک کہ لوگوں کے دل میں قوم پرستی کے جذبہ کی جگہ تمدنی و اجتماعی انقلاب (Social revolution) کا جذبہ پیدا ہو جائے" (ص ۱۴۵)

"بعض لوگ جو عدم تشدد کا عقیدہ رکھنے کے مدعی ہیں، کہتے ہیں کہ شخصی ملکیت کو اس کے مالکوں کی مرضی کے خلاف قومی ملکیت بنانے کی کوشش کرنا جبر ہے، اس لیے یہ عدم تشدد کے خلاف ہے......۔ یہ کافی نہیں سمجھا جاتا کہ اکثریت موجودہ نظام میں تبدیلی چاہتی ہے اس کے ساتھ یہ شرط لگائی جاتی ہے کہ جن لوگوں کو اس تبدیلی سے نقصان پہنچنے والا ہے انھیں بھی راضی کر لینا چاہیے......۔ یہ امید رکھنا کہ ایک پورے طبقے یا پوری قوم کے عقائد بدلے جا سکیں گے یا اپنے حریفوں کو عقلی دلائل سے قائل کرنے، یا ان کے جذبۂ انصاف کو ابھارنے سے باہمی مخالفت دور ہو جائے گی، اپنے آپ کو دھوکہ دینا ہے۔ یہ محض ایک فریب خیال ہے کہ مؤثر دباؤ ڈالے بغیر، یعنے جبر و تشدد سے کام لیے بغیر کوئی حاکم قوم محکوم ملک سے قبضہ اٹھالے گی، یا کوئی طبقہ اپنے اقتدار یا امتیازی حقوق سے دست بردار ہو جائے گا"۔ (ص ۵۸-۴۵۶)

"دراصل جمہوری حکومت کے معنی یہ ہیں کہ اکثریت، اقلیت کو ڈرا کر اور دھمکا کر اپنے قابو میں رکھتی ہے"۔ (ص ۴۵۵)

"سوسائٹی کی موجودہ کشمکش یعنی قومی جنگ اور پھر طبقات کی جنگ کا تصفیہ جبر کے سوا کسی اور صورت سے ممکن نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ پہلے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے کا

کام بہت بڑے پیمانہ پر کرنا پڑے گا۔ کیونکہ جب تک بہت بڑی جماعت ہم خیال نہ ہو جائے اس وقت تک نظام تمدن کو بدلنے کی کوئی تحریک مضبوط بنیاد پر قائم نہ ہو سکے گی لیکن اس کے بعد تھوڑے لوگوں پر جبر کرنے کی ضرورت ہوگی" (ص ۶۷-۴۶۹)

یہ ہے وہ نقشہ جو ہندوستان کی نجات کے لیے اس کے سب سے بڑے لیڈر کے ذہن میں ہے قومی حکومت (یعنی وہ حکومت جو مذہبی قومیتوں کو مٹا کر "قومی" بنائی جائے) آخری منزل مقصود نہیں ہے بلکہ پہلا مرحلہ ہے۔ دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ مذہبی عقائد کے بجائے معاشی عقائد کی تبلیغ کر کے ایک عظیم اکثریت کو ہم خیال بنایا جائے۔ اس کے بعد تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ جو اقلیت اس معاشی مذہب کی پیروی قبول نہ کرے اس کو ڈرا کر، دھمکا کر، لوٹ مار اور قتل و غارت گری کر کے، وسیع پیمانہ پر اجتماعی ڈاکہ زنی کر کے نظام تمدن میں انقلاب پیدا کیا جائے۔ پھر آخری مرحلہ یہ ہے کہ تھرڈ انٹرنیشنل کے اصول پر تمام دنیا میں کمیونزم کی اشاعت اور اس کے قیام کا بیڑا اٹھایا جائے جس طرح تھوڑی مدت قبل روس نے اٹھا رکھا تھا۔

پنڈت جواہر لال سمجھتے ہیں کہ مسلمان بہادر ہیں، مو کے ہیں، اور اس کے ساتھ ان کے اندر اشتراکیت کے عناصر پہلے سے موجود ہیں، لہٰذا ہندوؤں کی بہ نسبت وہ اس اشتراکی انقلاب کے لیے زیادہ اچھے سپاہی بن سکتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے:—

"میرے خیال میں عام مسلمان، عام ہندوؤں سے زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کے نظام اجتماعی میں ایک حد تک آزادی پائی جاتی ہے اور اگر ان میں ایک مرتبہ بیداری پیدا ہو جائے تو غالباً وہ اشتراکیت کی راہ تیزی سے قدم بڑھائیں گے" (صفحہ ۵)

جیسا کہ اوپر کی عبارت سے ظاہر ہے پنڈت جی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمان ایک جماعت ہیں، یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ وہ ایک مذہبی جماعت ہیں (کیونکہ ان کو "مسلمانوں" کے نام سے یاد کرنا خود ہی مذہب کی بنیاد پر ان کو ایک مستقل جماعت تسلیم کرنے کا ہم معنی ہے) اور یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ان کا ایک مستقل سوشل سسٹم ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کوئی ثبوت اس امر کا نہیں ہو سکتا کہ وہ ان تینوں حقیقتوں سے بے خبر نہیں ہیں۔

اب ملاحظہ ہو کہ وہ اس مذہبی جماعت کی قومیت اور اس کے مستقل سوشل سسٹم یعنی اس کی جداگانہ تہذیب کے متعلق کیا ارشاد فرماتے ہیں:۔

"مسلم قوم کا تخیل تو صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پرواز خیال ہے۔ اگر اخبارات اس کی اس قدر اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے اور اگر زیادہ لوگوں کو اس پر اعتقاد ہوتا بھی تو حقیقت سے دوچار ہونے کے بعد اس کا خاتمہ ہو جاتا" (ص ۳۳۲)

"لیکن یہ اسلامی تہذیب ہے کیا چیز؟ کیا یہ عربوں ایرانیوں اور ترکوں وغیرہ کے بڑے بڑے کارناموں کی ایک یاد ہے جو نسلی تعلق کی وجہ سے اب تک باقی ہے؟ یا اس کا مطلب زبان، آرٹ، موسیقی اور رسم و روایات ہیں؟ مجھے تو یاد نہیں آتا کہ کوئی شخص آج کل اسلامی موسیقی یا اسلامی آرٹ کا کبھی ذکر کرتا ہو" (ص ۳۳۲)۔

"میں نے یہ سمجھنے کی بہت کوشش کی کہ یہ اسلامی تہذیب ہے کیا چیز۔ مگر میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں اس میں کامیاب نہ ہوا۔ میں دیکھتا ہوں کہ شمالی ہند میں متوسط طبقہ کے مٹھی بھر مسلمان، اور ہندو بھی اسی طرح، فارسی زبان اور روایات سے متاثر ہوئے ہیں۔ جب عوام الناس پر نظر ڈالتا ہوں تو اسلامی تہذیب کی نمایاں ترین علامتیں یہ نظر آتی ہیں

ایک خاص قسم کا پاجامہ نہ زیادہ لمبا نہ زیادہ چھوٹا۔ ایک خاص طریقہ سے مونچھوں کو منڈانا یا ترشوانا مگر ڈاڑھی کو بڑھنے کے لیے چھوڑ دینا۔ اور ایک خاص قسم کا ٹونٹی دار لوٹا۔ بالکل اسی کے جواب میں ہندوؤں کے بھی چند رسمی طریقے ہیں، یعنی دھوتی باندھنا، سر پر چوٹی رکھنا اور مسلمانوں کے لوٹے سے مختلف طرز کی لٹیا رکھنا۔ یہ امتیازات بھی دراصل زیادہ تر شہروں میں پائے جاتے ہیں اور مفقود ہوتے جارہے ہیں۔ ہندو اور مسلم کاشتکاروں اور مزدوروں میں شکل ہی سے فرق کیا جاسکتا ہے تعلیم یافتہ مسلمان شاذ ہی ڈاڑھی رکھتے ہیں علیگڈھ والے البتہ سرخ ترکی ٹوپی کے گرویدہ ہیں (اس کا نام ترکی ہے حالانکہ خود ٹرکی میں اب اسے کوئی نہیں پوچھتا) مسلمان عورتیں ساڑی پہننے لگی ہیں اور آہستہ آہستہ پردہ سے باہر نکل رہی ہیں"۔ (ص ۳۳۵)

دیکھا آپ نے۔ ایک جگہ جس قوم کے مستقل اجتماعی وجود کو تسلیم کیا گیا تھا، دوسری جگہ اسکی قومیت سے قطعی انکار ہے۔ ایک جگہ جس تہذیب کی آتنی طاقت تسلیم کیگئی تھی کہ مسلم قوم کے اجتماعی نظام میں اسکی بدولت "ایک حد تک" آزادی پائی جاتی ہے، دوسری جگہ اسی تہذیب کو باتوں میں اڑایا جاتا ہے۔ اسکو ایک بے اصل چیز قرار دیا جاتا ہے۔ وہ محض پرانی قوموں کی دھندلی سی یاد ہے، یا زبان، آرٹ اور موسیقی ہے، یا چند نہایت حقیر امتیازی علامات اور چند ایسی ہی دوسری چیزوں کا مجموعہ ہے جو مٹتی اور فنا ہوتی جارہی ہیں لیکن یہ کہتے کہتے دفعتہً یاد آتا ہے کہ نہیں، یہ چیز تو ابھی موجود ہے۔ اس لیے پھر یوں ارشاد ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانو! تم یہ کس چیز کو لیے بیٹھے ہو؟ زمانے کے انقلابات اس کو مٹا رہے ہیں، مٹا دینگے اور خود مسلمان قومیں اس کو چھوڑ رہی ہیں۔

"اب تو قومی تہذیبوں کا زمانہ بہت تیزی کے ساتھ ختم ہو رہا ہے اور پوری دنیا ایک تہذیبی

وحدت بنتی جارہی ہے ...... اس ناگزیر رجحان کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا" (ص ۳۳۲)۔

"اس زمانہ میں ہندی مسلمانوں کو پیہم صدمات پہنچے ہیں۔ اور ان کے بہت سے خیالات جن کی پرورش بڑی تمناؤں سے کی گئی تھی پاش پاش ہو گئے۔ اسلام کے مرد غازی ترک نے نہ صرف یہ کہ اس خلافت ہی کو ختم کر دیا جس کے لیے ہندوستان ۱۹۲۰ء میں اتنا لڑا تھا، بلکہ کے بعد دیگرے ایسے قدم اٹھائے ہیں جو مذہب سے اس کو دور ہی لیے جا رہے ہیں .... مصر بھی اسی راستہ پر جا رہا ہے ...... یہی حال عربی ممالک کا ہے سوائے ملک عرب کے جو بہت پیچھے ہے۔ ایران کی نظریں اپنے تمدنی احیار کے لیے تاریخ قبل از اسلام پر پڑتی ہیں۔ غرض ہر جگہ مذہب بالکل پس پشت ڈالا جا رہا ہے اور وطنیت جنگ آزما لباس میں ظاہر ہو رہی ہے۔" (ص ۳۳۶)۔

مطلب یہ ہے کہ جو چیز فنا ہو رہی ہے، جس کا فنا ہونا یقینی ہے، جس کو سب مسلمان تو میں چھوڑ رہی ہیں اسے تم کیوں پکڑے بیٹھے ہو۔ چھوڑ دو اسے اور آؤ اس راستہ کی طرف جدھر ہم بلا رہے ہیں۔

یہ سب کچھ کہنے کے بعد پھر بھی دل میں تردد باقی رہتا ہے کہ یہ کمبخت مذہب پرست مسلمان، اپنی تہذیب اور قومیت پر جان دینے والے متعصب لوگ، اتنا سمجھانے پر بھی نہ مانیں گے۔ لہذا ایک آخری حربہ استعمال کیا جاتا ہے۔ مسلمان کے دل میں انگریز اور اس کی غلامی سے جو نفرت ہے اسے مدد پر بلایا جاتا ہے، اور اس سے یوں کام لیا جاتا ہے:۔

"ہندوستان میں مسلم قوم اور اسلامی تہذیب پر اور ہندو مسلم تہذیبوں کے انتہائی اختلاف پر بڑا زور دیا جاتا ہے، پھر اس سے یہ لازمی نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ برطانیہ کا ہندوستان میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہنا ضروری ہے تاکہ دونوں میں توازن قائم رکھے اور بیچ بچاؤ کرے" (صفحہ ۳۴)

"(مسلم قومیت کا ذکر کرنے کا) مطلب یہ ہے کہ مطلق العنان حکومت یہاں رہنی چاہیے یا بدیسی حکومت"۔ (ص ۳۳۱)

"ہاں اب مسلم قوم اور اسلامی تہذیب کا کیا ہوگا؟ کیا یہ دونوں آئندہ صرف شمالی ہند میں برطانیہ کی شفیق حکومت کے تحت پھلتی پھولتی رہیں گی؟ (ص ۳۳۲)۔

یہاں ہندوستان کے "قومی لیڈر" نے اپنی سیاست دانی کے جوہر پوری طرح نمایاں کیے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اسلامی تہذیب اور اسلامی قومیت صرف سرکار برطانیہ ہی کے سہارے جی سکتی ہے، لہٰذا جو لوگ ان دونوں کو باقی رکھنا چاہتے ہیں وہ سب ٹوڈی اور سرکار پرست ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ بدیسی حکومت یہاں ہمیشہ قائم رہے۔ اب اگر اس ملعون سامراج سے نجات چاہتے ہو، اگر آزادی کی خواہش ہے تو اس قومیت اور تہذیب کے تحفظ کا نام لینا چھوڑ دو، ورنہ جو کوئی یہ نام لے گا، ٹوڈی قرار دیا جائیگا —— یہ آخری ضرب بڑی کاری ضرب ہے۔ ہماری قوم کے بہت سے حرّیت پسندوں کو یہی ضرب "آزادی کی فوج" میں کھینچ لے گئی ہے اور بہت سے اُن لوگوں کی زبانوں پر اس نے مہر لگا دی ہے جو حرّیت پسند کہلانا چاہتے ہیں اور ٹوڈیت کے گھناؤنے خطاب سے بچنا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد پھر جواہر لال کے یہ الفاظ پڑھیے کہ "اگر مسلمانوں میں ایک مرتبہ بیداری پیدا ہو جائے تو غالباً وہ اشتراکیت کی راہ میں تیزی سے قدم بڑھا سکیں گے"۔

اب آپ اُس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں پنڈت نہرو کے اُس جدید انقلابی طریقہ سے آپ کو روشناس ہونا چاہیے جو انہوں نے "فرقہ وارانہ مسئلے" کو حل کرنے کے لیے تجویز فرمایا ہے۔

پنڈت جی خوب جانتے ہیں کہ مسلمانوں کے ہوشمند لوگ جو اسلام سے واقف ہیں، جن میں اپنی ملت و قومیت کا شعور پوری طرح موجود ہے، جو اپنی قومی تہذیب کو ہر چیز سے زیادہ قیمتی سمجھتے ہیں، وہ تو قیا

اِس پوزیشن کو قبول کرنے پر راضی نہ ہوں گے۔ ان کے لیے قطعی ناممکن ہے کہ اسلامی قومیت کو چھوڑ کر ہندوستانی قومیت میں اپنے آپ کو ضم کر دیں۔ ان کو ایک لمحہ کے لیے بھی یہ گوارا نہیں ہو سکتا کہ اس تہذیب کو خیرباد کہدیں جسے وہ اس گئی گذری حالت میں بھی اپنی عزیز ترین متاع سمجھتے ہیں۔ قومیت کو چھوڑنا، تہذیب سے دست بردار ہونا، جدید ہندی قومیت اور اشتراکی تہذیب و تمدن میں جذب ہو جانا تو بہت دور کی چیزیں ہیں مسلمانوں کے اس گروہ سے تو الٹا یہ خطرہ ہے کہ ہندوستان کے آزاد نظام حکومت میں وہ اپنی قومیت اور اپنی تہذیب کو زیادہ مضبوطی کے ساتھ قائم کرنے کی کوشش کریگا، اور اس غرض کے لیے حکومت کے اقتدار میں برابر کی شرکت حاصل کرنا چاہے گا۔

اس خطرے کو اچھی طرح محسوس کر کے پنڈت جی نے یہ تدبیر نکالی ہے کہ مسلمانوں کی قومی جمعیتوں سے اب خطاب ہی نہ کیا جائے بلکہ ان کے افراد تک براہ راست پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ یہ افراد جو منتشر ہیں، مفلس ہیں، اسلام اور اس کی تہذیب کے اصولوں سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں، اسلامی نظام اجتماعی کا شیرازہ درہم برہم ہو جانے کی وجہ سے ان پر اسلام کی گرفت قائم نہیں رہی ہے، اور جہالت یا مغربی تعلیم کی وجہ سے ان کا شعور اسلامیت بڑی حد تک مضمحل ہو چکا ہے، اس لیے ان کو بآسانی توڑ لیا جا سکتا ہے قبل اس کے کہ مسلمانوں کا "بورژوا" طبقہ ——— اشتراکی زبان میں قوم کے اہل دماغ اور متوسط طبقوں کا یہی نام ہے ——— بیدار ہو کر اپنی قوم کو سنبھالنے کی فکر کرے، توم کو اس کے قابو سے نکال لیا جائے یا زیادہ صحیح الفاظ میں اس کی "شدھی" کر لی جائے۔

یہی حقیقت ہے اُس پالیسی کی جس کو مُسلم عوام کے ساتھ ربط قائم کرنے " (Muslim mass Contact) کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ پنڈت جی نے آل انڈیا نیشنل کنونشن کے خطبۂ صدارت میں اس پالیسی کی تشریح ان الفاظ میں فرمائی تھی:-

"ہم نے عام لوگوں سے نگاہ ہٹا کر مدتوں فرقہ وارانہ لیڈروں کی باہمی مصالحت اور گفت وشنید میں وقت گنوایا ہے۔ یہ طریقہ غلط ہے اور میں چاہتا ہوں کہ ہم دوبارہ ادھر نگاہ بھی نہ ڈالیں۔ ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو مسلمانوں کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملتوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی کوئی گنجائش نہیں۔ آج جماعتوں اور ملتوں کی بنیاد معاشی مفاد پر رکھی جارہی ہے اور اس لحاظ سے ہندو مسلمان، سکھ، عیسائی، سب ملتوں کا بھلا اسی میں ہے کہ اپنی بیکاری اور غریبی کو سامنے رکھ کر سب مل کر قومی آزادی کے لیے آگے بڑھیں جب کبھی ہم اوپر کے لوگوں سے منہ موڑ کر عام لوگوں کی طرف نگاہ ڈالیں گے تو ہمیں ان معاشی مصیبتوں کا حل تلاش کرنا پڑے گا۔ جو سوال ایک زمانہ سے فرقہ وارانہ مسئلہ بن گیا ہے اس کا صحیح حل یہی ہے"۔

کیسے معصوم کیسے بے ضرر ہیں یہ الفاظ! مگر کتنے زہریلے ہیں! اس سے پہلے جو تصریحات خود پنڈت جی کی زبان سے میں نقل کرچکا ہوں! ان کو سامنے رکھ کر جب آپ اس نئی پالیسی کو دیکھیں گے تو صاف نظر آجائے گا کہ یہ دراصل شدھی کی تحریک ہے ایک دوسری شکل میں۔ یہ مذہبی شدھی نہیں سیاسی اور معاشی شدھی ہے اور اس کا نتیجہ عملاً وہی ہے جو مذہبی شدھی کا تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ کھلی ہوئی تحریک ارتداد تھی جس پر مسلمانوں کے جاہل اور عالم سب چوکنے ہوگئے تھے۔ اور یہ ایسی خفی تحریک ارتداد ہے کہ جہلا تو درکنار علماء تک اس کی کنہ کو پہنچنے میں دقت محسوس کر رہے ہیں۔ اُس تحریک کے بانیوں نے پھوہڑپن سے کام لیا تھا۔ انہوں نے مسلمانوں سے کہا کہ تم اپنی قومیت اور اپنے مذہب کو چھوڑ کر ہندو قومیت اور مذہب میں آجاؤ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں کوئی کودن سے کودن آدمی بھی ایسا نہ تھا جو اس پر بھڑک نہ اٹھا ہو۔ بخلاف اس کے اِس تحریک کا بانی ایک ہوشیار شخص ہے یہ کہتا ہے کہ تم کوئی قوم ہی نہیں ہو۔ تمہاری کوئی تہذیب ہی نہیں ہے۔ لہٰذا کسی چیز کے چھوڑنے کا کوئی

سوال ہی نہیں۔ دراصل تم ایک قوم یعنی "ہندوستانی قوم" کے فرد ہو مگر سامراج کے ایجنٹوں نے تم کو اس قوم سے جدا کر رکھا ہے۔ آؤ اپنی قوم میں مل جاؤ، آزادی حاصل کرو، اور اس اشتراکی تہذیب کے قائم کرنے میں حصہ لو جس میں تم کو خوب روٹیاں ملیں گی ـــــ ہے یہ بھی زہر ہی کا گھونٹ مگر دیکھیے، کیسے کیسے ہوش گوش کے لوگ اسے شیرِ مادر سمجھ کر نوش فرما رہے ہیں۔

مجھے یہ الزام دینے میں جلدی نہ کیجیے کہ ایک شخص کے خیالات کو نقل کر کے ایک پوری جماعت کو بدنام کرنا چاہتا ہے نہیں اب یہ ایک شخص کے انفرادی خیالات نہیں رہے، بلکہ انڈین نیشنل کانگریس کی سرکاری پالیسی بن گئے ہیں۔ آگے چل کر میں ناقابلِ انکار شہادتوں سے ثابت کروں گا کہ کانگریس کا پورا نظام اس وقت انہی اصولوں پر چل رہا ہے۔ جو پنڈت جواہر لال کی زبان سے ابھی آپ سن چکے ہیں۔ (باقی)

ترجمان القرآن کے سابق مضامین کی اشاعت کے لیے اعانت کی جو درخواست کی گئی تھی اس کے سلسلہ میں مزید ڈیڑھ سو روپیہ حالی اور ڈیڑھ سو روپیہ کلدار وصول ہوئے ہیں۔ اس طرح یہ سرمایہ پانچ سو پچاس روپیہ حالی اور دو سو روپیہ کلدار تک پہنچ گیا ہے۔

ان صفحات میں اسلامی ہند کے مستقبل پر جو مضامین لکھے گئے ہیں ان کا مجموعہ ایک رسالہ کی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے جو سر دست صرف دس ہزار طبع ہوگا قیمت پانچ پیسے فی نسخہ رکھی گئی ہے یعنی ۱۲/ سینکڑا۔ جو حضرات اس مضمون کی اشاعت میں حصہ لینا چاہیں وہ حسب ذیل پتہ پر مراسلت فرمائیں:ـــ

مہتمم "پیغام حق" ڈاکخانہ جمال پور۔ براہ پٹھان کوٹ (پنجاب)

مقالات

اسلام اور موجودہ مدنی مسائل

از جناب مولانا حکیم محمد عبدالرؤف صاحب داناپوری

(مولانا ممدوح نے جامعہ ملیہ دہلی کی مجلس دینیات کے سامنے جو مقالہ اسلام اور موجودہ مدنی مسائل کے عنوان سے پڑھا تھا، اس کا وہ حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے جس میں سیاسیات اور معاشیات پر بحث کی گئی ہے)۔

نظام حکومت: جب سے انسان نے اجتماعی زندگی شروع کی، اسی وقت سے کسی نہ کسی پیمانہ پر نظام حکومت اور قانون سازی کا سلسلہ بھی جاری ہے اور ہر زمانہ میں بہترین انسانی عقول اور انسانی قوتیں نظم حکومت اور قانون کو زیادہ سے زیادہ مفید بنانے میں مصروف ہوتی رہی ہیں۔ حکومت کے ہزار ہا نظام اور قوانین کے صدہا اصول بنائے گئے، لیکن مقصود اصلی کے لیے کوئی مکمل نظام مرتب نہ ہو سکا۔ اصل مقصود یہ تھا کہ اجتماعی زندگی میں انسان کی اجتماعی طاقت انسان کی ترقی میں صرف ہو سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے دو باتیں نہایت ضروری تھیں۔ امن اور حقوق کی صحیح تقسیم۔ انہی دو باتوں کے لیے نظام قانون سازی کی ابتدا ہوئی۔

مقصد اصلی تو یہ تھا۔ مگر ہوا کیا؟ یہ کہ ایام قبل تاریخ و بعد تاریخ (زمانۂ جاہلیت) میں انسان کی اجتماعی طاقت بہت سے چھوٹے چھوٹے حصوں میں بٹ گئی اور انسانی نسل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ وطن اور خاندان اور نسل کی بنا پر بہت سی جدا جدا قومیں بن گئیں اور ساری قومیں اپنے اپنے تفوق اور ر

برتری کا دعویٰ کرنے لگیں۔ حقوق کو صحیح طور پر سمجھنے کے بجائے قومیت کے معیار پر استحقاق کو دیکھا جانے لگا۔ عصبیت قومی سب سے زیادہ قابل تعریف شے سمجھی جانے لگی۔ حق و باطل کا امتیاز قومی تعصبات کے اندر فنا ہو کر رہ گیا۔

زمانۂ وسطیٰ میں نظام حکومت اور قانون سازی کے بے شمار طریقوں کا تجربہ ہوا۔ شخصی سلطنتیں قائم ہوئیں۔ مخلوط حکومتیں بنیں۔ جمہوری نظام قائم ہوا۔ طرح طرح کے قوانین بنائے گئے۔ بے حد و حساب اصلاحات ہوتی رہیں۔ لیکن زمانۂ جاہلیت کی قائم شدہ قومی تفریق نے سب کو مٹا دیا اور ہمیشہ اس تفریق نے دنیا کو فتنہ و فساد میں مبتلا رکھا۔ قوموں کی قومیں، ملک کے ملک انسانی نسل کی اسی قومی تفریق کی وجہ سے فنا ہو گئے۔

اس وقت جس دور کو انسانی ترقی کا بہت روشن دور سمجھا جاتا ہے، جس میں علوم و صنائع کمال تک پہنچے ہوئے ہیں، اس میں بھی اسی جاہلیت کی قومی تفریق نے سب سے زیادہ آفت مچا رکھی ہے۔ یورپ اس وقت ترقی یافتہ اور سمجھدار خطہ ہے۔ وہاں ہر طرف جمہوری حکومتیں قائم ہیں لیکن جمہوریت کی بنیاد بھی اسی قومی تفریق پر رکھی گئی ہے۔ اس وقت قومیت کے معنی وطنیت کے ہیں، یعنی ایک وطن اور ایک ملک کے باشندے اپنی فلاح و بہبود کے لیے، اپنی قومی و ملکی برتری کے لیے جس طرح چاہیں قانون بنائیں، کوئی قوت ان کو اس سے نہیں روک سکتی۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہاں کی ساری قومیں ایک دوسرے کی دشمن ہو رہی ہیں۔ علوم و فنون فلسفہ و سائنس، صنعت و حرفت جو انسانی ترقی کے ذرائع ہیں، وہاں بڑے سے بڑے پیمانہ پر ان سے انسان کو تباہ و برباد کرنے کا کام لیا جا رہا ہے۔ شخصی حکومتوں کے زمانہ میں اشخاص ایک دوسرے کو ستاتے تھے۔ قوی ضعیف پر ظلم کرتا تھا۔ دولتمند غریب پر مصیبتیں نازل کرتا تھا۔ اب جمہوریت کے زمانہ میں ایک قوم دوسری قوم سے لڑتی ہے۔ طاقتور قوم ضعیف قوم کو تباہ و برباد کرتی ہے۔ دولت مند قوم غریب قوم کو لوٹتی بلکہ فنا کر دیتی ہے۔ بہر صورت نتیجہ مشترک

جس سے یہ مصیبتیں نازل ہوتی ہیں، وہی قومی تفریق، وہی جاہلیت کا قومی تعصب، وہی آبائی رسم کی قومیت ہے۔ جمہوریت اور اعلیٰ قانون سازی کے دعووں نے اس کو مٹایا نہیں، اور بڑھا دیا۔ اس ناجائز قومیت کے ساتھ جب تک شخصیت تھی دنیا کے لیے وہ عام خطرہ نہ تھا جو آج جمہوریت و قومیت کے جمع ہو جانے سے نظر آ رہا ہے۔

یورپ کے عقلا اور سیاسیین اس وطنیت کے بڑھتے ہوئے فتنوں سے ناواقف نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یورپ کے لیے یہ مرض لاعلاج ہو چکا ہے اور یہی چیز اس کو تباہ کر کے رہے گی۔ یورپ نے اس کا ایک علاج سوچا تھا، یعنی انٹرنیشنل کانگریس لیکن انٹرنیشنل قانون کی دھجیاں بکھر چکیں۔ وہ بے دست و پا ہو کر رہ گیا۔ جہاں کا ہر شخص نیشنلزم میں فنا ہو وہاں انٹرنیشنل قانون کا مخلص حامی کہاں سے آئے؟ نیشنل قانون کی حمایت ہیں ساری قومیں علحدہ علحدہ بٹ چکیں، انٹرنیشنل قوم کہاں سے پیدا کی جائے

انسان اور انسانی نسل کو وطن یا خاص خاص نسلوں کی بنا پر بے شمار قوموں میں تقسیم کر دینا دنیا میں سب سے بڑی لعنت ہے جو جڑ پکڑ چکی ہے۔ ابتدا میں جب انسان نے اجتماعی زندگی شروع کی تھی اس وقت حفاظت کے لیے اس کی ضرورت ہوگی۔ مگر آج قومیت کے اس ابتدائی جاہلیت کے معیار کو قائم رکھنا انسانی زندگی کے لیے مصیبت عظمیٰ ہے۔ یہ تقسیم ہمیشہ عالم انسانی کے امن و امان کو تباہ و برباد کرتی رہی ہے اور کرتی رہے گی۔ قومیت کا یہ معیار قائم رہا تو حکومت کے قاعدے میں جس قسم کی تبدیلی بھی کی جائے اس سے دنیا کا امن بحال نہیں ہو سکتا۔ حکومت خواہ شخصی ہو یا جمہوری نازی ہو یا فاسسٹ، سوشلسٹ ہو یا کمیونسٹ، جب تک اس کے ساتھ قومیت اور عصبیت باقی رہے گی، دوسری قوموں کے لیے وہ آفت ہی رہے گی۔ اصل ضرورت یہ ہے کہ قومیت کے وطنی معیار کو مٹا دیا جائے، اور اس تفریق کے مٹانے کا مطلب ہی یہ ہے کہ تمام دنیا کے انسان ایک اخوت کی بندش میں شامل ہو جائیں۔

اس مصیبت کا علاج صرف اسلامی تعلیم کے اتباع سے ہو سکتا ہے۔ اس کے سوا اور کوئی ممکن العمل صورت موجود نہیں ہے۔ اسلام نے بڑی سختی سے عصبیت قومی اور نخوت جاہلیت کو روکا۔ حضور صلعم نے فتح مکہ کے روز اس قومی تفریق اور نسبی تفاخر کو اپنے پیروں سے روند کر مٹا دیا۔ عرب وعجم کو ایک اخوت کے رشتہ میں منسلک کر دیا۔ فرمایا کونوا عباد اللہ اخوانا۔ اور فرمایا المومنون کرجل واحد ان اشتکی عینہ اشتکی کلہ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی تعلیم سے ایک ایسی قوم پیدا ہوئی جس میں ہزارہا قومیں مدغم ہو کر ایک بڑی قوم بن گئی جس کا نام "مسلم قوم" ہے۔ اس کے اجزاء ترکیبی کو دیکھو تو اس میں صدہا بلکہ ہزارہا ایسی قومیں ملیں گی جن کو ایک دوسرے سے مطلقاً کوئی نسبت نہ تھی۔ ترکی، تاتاری، شامی، عربی، مصری، عراقی، ایرانی، افغانی، حبشی، مغربی، مغل، ہندی، سندھی، چینی اور اقطاع عالم کی بے شمار قومیں ایک رنگ میں رنگ گئیں۔ عقائد و عبادات ہی میں نہیں، معاشرت اور معاملات کے مسائل میں بھی سب ایک ہو گئے۔ کھانا، پینا، حلت وحرمت کا امتیاز، ذبیحہ کا طریقہ، شادی بیاہ، موت و غم، ساری باتوں میں ایک رنگی و یکجہتی پیدا ہو گئی۔

اسلام نے متحدہ قومیت کو اصول قرار دے کر نظام حکومت کے بہت سے ارکان لازمی قرار دیے تھے۔ ان میں سے ایک اہم چیز یہ تھی کہ ایک وقت میں مسلمانوں کی دو مستقل حکومتیں نہیں ہو سکتیں۔ مسلمان کسی ملک کسی قوم و نسل اور کسی مرتبے کے ہوں، ان پر فرض ہے کہ سب مل کر ایک کو خلیفہ بنائیں اور اسکی بیعت کریں۔ دوسرا کوئی خلافت کا دعویٰ کرے تو اس کی گردن ماردیں۔ ابوداؤد کی روایت ہے من مات ولیس فی عنقہ بیعۃ فمات میتۃ الجاھلیۃ۔ اور صحیح مسلم کی روایت ہے۔ اذا بویع للخلیفتین فاضربوا عنق الآخر۔

اسلام نے اس طرح عصبیت قومی کا خاتمہ کر کے فتنہ و فساد کی جڑ کاٹ دی تھی۔ مسلمان اگر اسلام کی اس تعلیم پر مستحکم رہتے تو مسلمانوں کی اندرونی تاریخ آج بالکل دوسری ہوتی۔ لیکن افسوس ہے کہ اسلام

کی اس اہم اور صریح تعلیم کے موجود رہتے ہوئے بھی قومیت کے جاہلانہ تفاخر کو پوری طرح مسلمان ترک نہ کرسکے۔ مسلمانوں کی اندرونی خونریزیوں کی تاریخ ایک ایک کرکے پڑھ جاؤ۔ معلوم ہوجائے گا کہ ان سب کی اصل وجہ یہی قومی عصبیت اور جاہلانہ قومی تفاخر ہے۔

جمہوریت قانون سازی کا اختیار ہر قوم کو علٰحدہ علٰحدہ دیتی ہے، اور ہر قوم صرف اپنے فوائد کو پیش نظر رکھ کر قانون بناتی ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک جمہوریت دوسری سے ٹکرا جاتی ہے! اسلام نے یہ نہیں کیا کہ کسی قوم کو قانون سازی کا اختیار نہیں دیا۔ بلکہ بلا لحاظ قومیت و وطنیت، تمام اہم اور مشترک امور کے لیے قانون یا اصول قانون خود مرتب کر دیا۔ البتہ ملکی خصوصیات اور وقتی ضروریات کے لحاظ سے ضمنی قوانین یا جزوی مسائل کے استنباط کا حق ہر ملک کے مجتہدین اور اہل حل و عقد کو عطا کیا۔ اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھے پیمانے پر حکمرانی کرکے ایک نظیر سامنے رکھدی۔ اس لیے اسلامی دائرے میں رہ کر قومی تصادم کا راستہ مسدود ہوگیا۔

خلفاء راشدین کے بعد مسلمانوں میں بھی اکثر جہالت کا پرانا قومی جذبہ بھڑک اٹھتا تھا اور اسی وجہ سے مسلمانوں کی اندرونی تاریخ بھی آپس کی لڑائیوں سے خالی نہیں۔ تاہم جن قوموں نے اسلام قبول کیا ان میں وہ مغائرت باقی نہیں رہی جو اسلام سے پہلے تھی یا جو اب بھی ان لوگوں میں موجود ہے جو اسی قوم کے لوگ ہیں مگر مسلمان نہیں ہیں۔

مسلمانوں میں بھی مذہبی اختلافات ہیں۔ مگر ان اختلافات سے مغائرت پیدا نہیں ہوتی اور دنیا میں کوئی قوم ایسی موجود نہیں ہے جس میں اس قسم کے اختلافات موجود نہ ہوں۔ ایسے اختلافات مٹ نہیں سکتے۔ یہ اختلافات علم، فہم، ادراک اور ذکاوت کے فرق کی وجہ سے ہیں۔ جس طرح دو آدمی شکل وصورت میں بجمیع وجوہ یکساں نہیں ہیں، اسی طرح فہم و ذکاوت میں بھی یکساں نہیں ہیں۔ لہذا فرق مراتب کی وجہ سے ایک ہی چیز کا مطلب سمجھنے میں اختلاف کرتے ہیں۔ ایسا اختلاف ایک نسل، ایک ملک، ایک

خاندان اور ایک گھر کے افراد میں بھی ہوتا ہے۔ اس سے مغائرت پیدا نہ ہونی چاہیے۔ ایسا اختلاف اگر ضد اور جہالت کی وجہ سے ہو تو برا ہے۔ اور علمی وجوہ کی بنا پر ہو تو باعث رحمت ہے۔

اقتصادیات دنیا کا دوسرا اہم ترین مسئلہ اقتصادیات کا انتظام ہے۔ ہر ملک کی انسانی آبادی کا ایک حصہ ایسا ہوتا ہے جو اپنی کم سے کم ضروریات زندگی بھی مہیا نہیں کر سکتا۔ بیوہ، یتیم، نابینا، معذور، مجبور، فقرا، مساکین وغیرہ سے کوئی ملک خالی نہیں ہے۔ حکومت اور سلطنت کو ایسے لوگوں کی کفالت کا ذمہ دار ہونا چاہیے۔ ہر ملک میں مستقل انتظام ہونا چاہیے کہ اس قسم کا کوئی انسان بھوکا نہ رہ جائے مگر جہاں تک دنیا کی تاریخ اور حکومتوں کے قوانین کا حال معلوم ہے، کسی سلطنت نے کبھی اس ذمہ داری کو قبول نہ کیا۔ قوانین ملک میں کبھی ایسے لوگوں کو کوئی مستقل جگہ نہ دی گئی۔ آج ساری جمہوری اور شخصی سلطنتوں کو دیکھا جاؤ۔ جدید تمدن کے سارے مدعیوں کا جائزہ لو۔ ایسے لوگوں کے لیے کوئی مستقل انتظام کسی ملک میں موجود نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کی زندگی محض اہل خیر کے رحم و کرم پر موقوف رہی ہے۔ سلاطین یا حکومتوں نے، پہلے یا موجودہ زمانہ میں جب کبھی ایسے لوگوں کے ساتھ کوئی سلوک کیا ہے تو احساناً کبھی وہ اس کے لیے نہ قانوناً مجبور تھے، نہ ہیں، اور نہ انہوں نے اس ذمہ داری کو قبول کیا ہے۔

اسلام اور صرف اسلام ہے جس نے اس کو حکومت کا سب سے زیادہ ضروری کام قرار دیا ہے۔ اسلام کا اقتصادی قانون اس بنیاد پر قائم ہے کہ ہر مسلمان پر زکوٰۃ فرض ہے، ٹھیک اسی طرح جس طرح نماز، روزہ اور حج فرض ہے۔ کوئی مسلمان زکوٰۃ کی فرضیت سے انکار نہیں کر سکتا اور جو انکار کرے وہ مسلمان نہیں رہ سکتا۔ اسلامی حکومت کا اولین فرض یہ ہے کہ بیت المال قائم کرے اور زکوٰۃ کے اموال کو ایسے مجبور لوگوں پر خرچ کرنے کا انتظام کرے۔ اموال ظاہرہ کی زکوٰۃ اسلامی حکومت جبراً وصول کرے گی۔ اموال باطنہ جن کا حال حکومت کو معلوم نہ ہو سکے، ان کی زکوٰۃ ادا کرنا بھی ہر مسلمان پر فرض ہے، اور بغیر اس فرض کو ادا کیے نجات نہیں ہو سکتی، البتہ ان اموال کا اختیار مالک

نصاب کو ہے۔ خود مستحقین کو دے دے یا وہ بھی بیت المال میں داخل کر دے۔

اسلام کی تعلیم کی رو سے ملک کے کل اموال نامیہ کا چالیسواں حصہ اور کل پیداوار کا دسواں یا بیسواں حصہ، اور کل جانوروں کا ایک مقررہ حصہ ہر سال ایسے لوگوں پر صرف کرنے کیلیے مخصوص ہے اور اسلامی حکومت ذمہ دار ہے کہ یہ سب مال صحیح طور پر ایسے لوگوں میں تقسیم کیا جائے۔ کیا ابتدائے آفرینش سے اب تک دنیا کے عقلاء نے، کسی قوم یا کسی حکومت نے کبھی کوئی قانون یا کوئی قاعدہ ایسا بنایا ہے جو ایسے مجبور انسان کے لیے اس سے بڑھ کر یا اس کے مثل مفید ہو اور قابل قبول بھی ہو؟ یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہے۔

سرمایہ داری اور غربت ہمیشہ ہر ملک اور ہر قوم کی یہ حالت رہی ہے کہ ملک کا مختصر طبقہ دولتمند اور سرمایہ دار ہوتا ہے اور اس ملک کا بڑا حصہ غریب اور مفلس ہوتا ہے۔ سرمایہ دار دولت کی طاقت سے غریبوں کو ستاتے ہیں، مجبور رکھتے ہیں، ان سے جفاکشی اور محنت کا کام لیتے ہیں، لیکن ان کی اور ان کے اہل و عیال کی ضروریات کے قابل بھی معاوضہ نہیں دیتے۔ انہی غریبوں اور محنت کرنے والوں کی محنت سے بہت کچھ نفع حاصل کرتے ہیں، اور ناجائز عیش و عشرت میں صرف کرتے ہیں۔ لیکن مزدوروں کا حق المحنت کبھی بالکل نہیں دیتے، کبھی مشکل بہت کم دیتے ہیں۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ سرمایہ دار سب ایک طرح کے ہوتے ہیں۔ نہ یہ مطلب ہے کہ سرمایہ داری فی نفسہ بری چیز ہے۔ تمدن و معاشرت کی ترقی کا ایک ضروری جز سرمایہ ہے۔ علمی اور صنعتی ترقیوں میں زبردست حصہ سرمایہ داروں کا ہے۔ اسلام نے مال کو حیات دنیا کی زینت کہا ہے۔ سرمایہ داری کو خدا کا فضل بتایا ہے۔ دولتمندی خدا کی نعمت ہے، وہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔ لیکن واقعہ یہی ہے کہ سرمایہ داری کے ساتھ کبر و غرور اور ظلم بھی عموماً ساتھ ہی ساتھ آتا ہے جو دنیا کی بدترین لعنت ہے۔

ہمیشہ اور ہر زمانہ میں سرمایہ داری اور دولتمندی کے ان تلخ نتائج کو روکنے کی عقلاء نے کوشش کی، مگر قطعاً کوئی نتیجہ بر آمد نہ ہوا حتی کہ بڑے بڑے غور و فکر کرنے والے یہ کہنے لگے کہ دنیا غریبوں کے رہنے کی جگہ نہیں ہے یعنی ان مظالم کا سدباب ناممکن ہے، اور مفکرین کی ایک جماعت اس نتیجہ پر پہنچی کہ اصلاح کا طریقہ صرف یہ ہے کہ سرمایہ داری ختم کردی جائے اور اقتصادی مساوات قائم کردی جائے۔

اقتصادی مساوات کی تحریک بھی غیر معلوم مدت سے دنیا میں جاری ہے۔ ایک وقت یونانیوں میں اس کا بڑا زور ہوا تھا۔ دوسری دفعہ ایران کے مزدکیوں نے تقریباً ڈیڑھ سو برس تک پورے ایران میں پوری قوت سے اس کو جاری رکھا۔ مگر کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ بلکہ سارا ملک تباہی میں مبتلا ہوگیا۔ یہی تحریک کچھ اصلاح کے ساتھ اب سوشلزم کے نام سے تقریباً یورپ کے کل ملکوں میں زور پکڑ رہی ہے اور یہی تحریک کچھ عملی تبدیلی کے ساتھ کمیونزم کے نام سے روس کے نظام حکومت کی بنیاد بنی ہوئی ہے۔

میں نہایت اختصار کے ساتھ عرض کرونگا کہ مساوات حقیقی یا اقتصادی مساوات کی تحریک جس قسم کی بھی ہو، غیر فطری، غیر مستقل، اور سخت مضر ہے۔ اسلام ایسی تحریکوں کو پسند نہیں کرتا اسلام نے جس قسم کی مساوات کا حکم دیا ہے وہ اور چیز ہے جیسا کہ آگے معلوم ہوگا۔

مساوات حقیقی یا اقتصادی مساوات اقتصادی مساوات کو اصول قرار دینے کی اب تک دو صورتیں معلوم ہوسکی ہیں۔ ایک یہ کہ ملک کے جمیع اموالِ قابلِ انتفاع میں اباحت مطلقہ ہو، یعنی جس شخص کو جس چیز کی حاجت ہو اس سے کوئی اس کو روک نہ سکے، جیسا کہ مزدکیوں کا اصول تھا۔ اس صورت کا تجربہ ہوچکا کہ اباحت مطلقہ کے ساتھ نظم ملک ناممکن ہے، اور نظم نہ ہو تو تباہی بھی لازم ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ملک کی کوئی قابلِ انتفاع چیز کسی کی ملک خاص نہ ہو، بلکہ سب چیزیں اہل ملک کی مشترک ملک ہوں

جیسا کہ سوشلزم اور بالشوزم کا مشترک اصول ہے۔ اس صورت میں نظم حکومت ممکن ہے، لیکن استقلال ناممکن ہے۔ اس لیے کہ ملک کی پوری قوت اور ساری دولت عملاً حکومت اور فوج کے اقتدار میں ہوجائے گی گو اسے قانونی الفاظ میں کتنا ہی محدود کیا جائے، اور رعایا کی ساری قوت مسلوب ہوجائے گی، اتنی بھی نہ رہے گی جتنی سرمایہ داروں کے نظام جمہورت میں رہتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ حکومت کی باگ جب تک ایسے لوگوں کے ہاتھ میں رہے گی جو ایثار پیشہ ہوں اور قانون کا اتباع کریں، نظم قائم رہے گا لیکن اگر ارباب حکومت اور فوج قانون توڑنا چاہیں تو رعایا بالکل مسلوب الاختیار ہوگی اور حکومت کے غیر قانونی افعال کی اتنی بھی مدافعت نہ کرسکے گی جتنی سرمایہ دار ممالک کی رعایا کر لیتی ہے

سوشلزم اور بالشوزم کی تحریک کا نتیجہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ فوری طور پر غربا اور مزدور پیشہ لوگوں کی حالت سنبھل جائے گی، اور ان کو بہت سے مصائب سے نجات حاصل ہوجائے گی یہی چیز ہے جس سے یہ تحریک آبادیوں کے کثیر حصہ کی دلچسپی اور کشش کی باعث بنی ہوئی ہے مگر ظاہر ہے کہ نتیجہ کے اعتبار سے یہ تحریک ملک کی سخت تباہی اور بربادی کا سبب بنے گی۔ ملک کی تمام مادی و اقتصادی قوت کو ایک جگہ جمع کر دینا اور افراد ملک کو بالکل مفلوج بنا دینا سخت خطرناک طریقہ ہے۔ یہ کہنا کہ ملک کی جمع شدہ قوت و دولت قانوناً ملک کے افراد ہی کے قبضہ میں رہے گی، بڑا سخت دھوکا ہے قانونی قبضہ اور عملی قبضہ میں بڑا فرق ہے۔ روس کی تحریک ابھی ابتدائی منزل میں ہے، اور ابتک ابھی لوگوں کے ہاتھوں میں رہی ہے جو مخلص تھے، اور اپنے اصول کی خاطر ہر طرح کے ایثار و قربانی کے لیے طیار تھے لیکن ان کے ایثار و قربانی سے تحریک کے خطرناک پہلو کا سد باب نہیں ہوسکتا۔

اس کے علاوہ اگر اس خطرہ کا سدباب بھی ہوجائے اور دنیا میں اقتصادی مساوات قائم بھی ہوجائے تو یہ چیز دنیا کے لیے مفید نہیں ہوسکتی۔ مضر ہوگی۔ فطرت اور منشاء الٰہی کے خلاف ہوگی دنیا کا تمام کام اختلاف مراتب کی وجہ سے چل رہا ہے۔ اقتصادی فرق ہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے

انسان بڑے سے بڑا مشکل اور خطرناک کام انجام دے سکتا ہے۔ اسی فرق کی وجہ سے انسان سخت سے سخت دماغی اور جسمانی جد وجہد پر مجبور ہوتا ہے اور یہی جد وجہد اور مسابقت ہر طرح کی علمی وصنعتی ترقی کا ذریعہ بنتی ہے۔ فرق مراتب اور مالی امتیازات مٹا دیے جائیں تو علمی وعملی کاموں کی تکمیل بالکل ناممکن ہو جائے گی

اسلام نے نہ حقیقی مساوات کی تعلیم دی ہے، نہ اس کو قبول کیا اور نہ جائز رکھا ہے۔ حضرت عائشہ رضی کی روایت ہے، حضورؐ نے فرمایا: انزلوا الناس منازلھم۔ امیر کی اطاعت ہر مسلمان کے لیے لازمی قرار دی۔ ہر جماعت اور ہر خاندان کے لیے امیر و مامور کا سلسلہ قائم کر دیا، حتّٰی کہ حکم دیا اذا کنتم ثلثۃ علی السفر فلیؤمروا احدکم۔ یعنی تین آدمی سفر میں ہوں تو اپنے میں سے ایک کو امام بنالیں امیر و مامور کے علیحدہ حقوق بتا دیے۔ افراد و اشخاص کی ملکیت کو جائز تسلیم کیا، جائداد منقولہ میں بھی اور غیر منقولہ میں بھی۔ اسی بنا پر کسی پر زکوٰۃ فرض ہوئی، کسی پر نہیں کسی کو زکوٰۃ لینے کی اجازت دی، کسی کے لیے حرام کر دیا۔ کسی پر حج فرض کر دیا، کسی پر نہیں۔ ملکیت ہی کے جواز پر فرائض کا قانون لازمی قرار دیا۔ کسی شخص کا مال بغیر اجازت جبراً لینا ناجائز کیا۔ حلال مال کے حصول وطلب کی رغبت دلائی تجارت، ملازمت، حکومت، صنعت وحرفت اور مال جمع کرنے کے سارے حلال وسائل کی ترغیب دی۔

یہ ساری باتیں اس پر دال ہیں کہ اسلام نے انسان کے فرق مراتب کو جائز رکھا ہے۔ اور اس کے ملحوظ رکھنے کی تاکید کی ہے۔ سرمایہ داری کو جائز رکھا ہے اور خاص اسلامی احکام میں بھی اس فرق کو ملحوظ رکھا ہے۔ باوجود اس کے سرمایہ داری کے مذموم اثرات کو روکنے کا ایسا مکمل انتظام کیا ہے جو نہ سوشلزم سے ہو سکتا ہے نہ کمیونزم سے۔

سرمایہ داروں کے مذموم طریقے جس طرح سائنس فی نفسہ مذموم چیز نہیں ہے بلکہ انسان، انسانی قوت انسانی تمدن اور معاشرت کی ترقی کا بہت بڑا ذریعہ ہے لیکن جب اس چیز کو انسان کی ہلاکت و تباہی اور ملک کی بربادی کے لیے استعمال کیا جائے تو وہ دنیا کے لیے مصیبت بن جاتی ہے، یہی حال

سرمایہ داری کا ہے۔ سرمایہ دار اگر اموال دنیا کو اچھے مصرف میں صرف کریں تو دنیا کو خوشحالی اور نیکی سے معمور کرسکتے ہیں، اور جن کو اللہ پاک توفیق عطا فرماتا ہے وہ یہی کرتے ہیں۔ لیکن زیادہ تر یہ ہوتا ہے کہ سرمایہ دار سرمایہ کی قوت سے غریب اور مفلس لوگوں کی جائدادیں اور مختصر زندگی کا سامان بھی چھین لیتے ہیں اور انہیں تباہ و برباد کردیتے ہیں۔

سرمایہ دار کرتے یہ ہیں کہ غریبوں کو لالچ دے کر اپنی طرف کھینچتے ہیں اور رفتہ رفتہ ان کا خون چوس لیتے ہیں۔ دولتمندوں نے دولت کے ذریعہ سے ملک کی دولت جمع کرنے کے بہت سے طریقے ایجاد کیے اور برابر ایجاد کرتے رہتے ہیں۔ ان ترکیبوں میں سب سے زیادہ اہم اور عام چیز ربوٰا (سود) کا کاروبار ہے۔ ربوٰا کا اصول یہ ہے کہ مال بغیر کسی محنت کے خود نفع پیدا کرے اور صاحب مال کسی نقصان کا ذمہ دار نہ ہو۔ تاجر کتنی ہی ہوشیاری و محنت سے کام کرے، کاریگر کتنی ہی جفاکشی و دیانت سے چیزیں بنائے، نقصان سے بے خطر نہیں ہوسکتا۔ اور سود خوار کتنا ہی کم سود لے مگر اس کا نفع مستقل اور پائدار ہوگا۔ اس کو کسی خطرہ کا اندیشہ نہیں ہے، نہ اس کو جفاکشی اور محنت کرنی پڑتی ہے۔

بیع کی بے شمار قسمیں سرمایہ داروں نے ایسی بنائی ہیں جو صرف کشش زر کا ذریعہ ہیں۔ مثلاً سٹہ یا بغیر مال کے فرضی بیع اور بیع در بیع۔ یہ بیع نہیں ہے، نہ بیع کے لیے کوئی چیز موجود ہوتی ہے محض سرمایہ جمع کرنے کا ذریعہ ہے۔ انشورنس سرمایہ داروں کی نئی ایجاد ہے اور بڑی کامیاب ایجاد۔ زندگی کا بیمہ کرتے ہیں، چیزوں کا بیمہ کرتے ہیں، مکان کا بیمہ کرتے ہیں اور گویا اموال اور زندگی کے تحفظ کا ایک حد تک ذمہ لیتے ہیں اور اسی ذمہ داری کے بدلے بے حساب دولت سمیٹ لیتے ہیں۔ غور کرو کہ یہ بیمہ کمپنیاں تھوڑے دنوں میں کس طرح یہ دولت سمیٹتی ہیں؟ یہ دولت کہاں سے آتی ہے؟ مزدور اپنا پیٹ کاٹ کر، کاریگر اپنا خرچ گھٹا کر، تاجر اپنے نفع نقصان سے بے پروا ہو کر جو کچھ اپنا

اپنا مال ان کمپنیوں کے حوالہ کر رہے ہیں۔

موجودہ دور کی عجیب حالت ہے یہ لوگ سرمایہ داروں کے مظالم سے تنگ آگئے ہیں مختلف ملکوں کا بڑا حصہ سرمایہ داری کو بالکل مٹا دینے کا حامی ہے۔ باوجود اس کے دولتمندوں کے ان تمام ہتھکنڈوں کی تائید کی جا رہی ہے جن پر سرمایہ داری کی بنیاد قائم ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس نمائشی مخالفت کے باوجود سرمایہ داری کو جو طاقت حاصل ہے وہ کبھی نہ تھی۔

اسلام نے نفس سرمایہ داری کو جائز رکھا ہے، مگر اس سرمایہ داری کو جو حلال، صحیح، اور غیر مشتبہ طریقہ سے حاصل ہو۔ سرمایہ داروں کے تمام مکر و فریب کے طریقوں کی اس نے سختی کے ساتھ مخالفت کی ہے اور سب کو ناجائز اور حرام کہا ہے۔ سود، جوا، سٹہ بازی، بیمہ یعنی قسمت کی بازی، بیع کی ساری مجہول اور فرضی قسمیں، سب ناجائز اور حرام ہیں اور جو سرمایہ ان طریقوں سے جمع ہو وہ بدترین سرمایہ ہے۔

ربوا یعنی سود خواری اسلام نے سود خواری کی بڑی سختی سے مخالفت کی ہے۔ سود خواری کو خدا کے ساتھ جنگ کہا گیا ہے۔ حضور صلعم نے سود خواروں کے ساتھ کبھی مصالحت نہ کی۔ نجران کے نصاریٰ کے ساتھ مصالحت کرتے وقت جو صلح نامہ لکھا گیا اس میں صاف طور سے حضور نے ظاہر کر دیا کہ تم میں سے جو صاحب وجاہت سود کھائے گا اس کا میں ذمہ نہیں لیتا۔ اطراف مدینہ میں یہود کے قبائل آباد تھے اور بڑے سود خوار تھے۔ یہود مشہور سود خوار قوم رہی ہے۔ ان کا مدینہ کے اطراف میں رہنا آپ نے کسی شرط پر منظور نہ کیا۔ قرآن پاک نے سود خوار کی سزا خلود فی النار بتائی ہے جو کفر و عناد کی انتہائی سزا ہے۔ یہ سب سختیاں اسی لیے ہیں کہ سود خواری کے ساتھ دنیا کی اقتصادی حالت کبھی درست نہیں ہو سکتی۔

سود کی حالت یہ ہے کہ مال مقررہ نفع پر غریبوں میں، تجارت کرنے والوں میں، کاریگروں میں

مزدوروں میں اور کاشتکاروں میں پھیل جاتا ہے اور ان سب کی محنت و مزدوری کی کمائی کا ایک مستقل حصہ سرمایہ دار کے پاس جمع ہوتا رہتا ہے۔ ہر کام میں خسارہ اور نقصان بھی ہوتا ہے۔ وہ سارا نقصان محنت کرنے والے کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ سرمایہ دار اس نقصان میں شریک نہیں ہوتا بلکہ نقصان کی حالت میں بھی وہ اپنا نفع غریب سے وصول کرتا ہے۔

سودخوار سب سے پہلے اپنے دوستوں کو، اپنے قبیلہ اور اپنی قوم کو، پھر ان سب کو جو اس کے ساتھ معاملہ کریں تباہ کر دیتا ہے۔ اور دوستی و ہمدردی کے ساتھ ان کا سب کچھ لوٹ لیتا ہے۔ ہمیشہ سے یہود دنیا کی مشہور سودخوار قوم ہے۔ اسی لیے یہودیوں کی یہ حالت ہے کہ جو ان میں دولت مند ہیں ان کی دولت کی انتہا نہیں ہے اور جو غریب ہیں ان کی پستی و ذلت کی بھی انتہا نہیں ہے۔ ہندوستان میں ہندوؤں کی ایک قوم ویش (بنیا) مہاجن اور سودخواری میں مشہور رہی ہے۔ اس قوم کی سرمایہ داری اور دولت مندی کی بھی انتہا نہیں ہے، مگر یہ دولت کہاں سے آئی؟ کیونکر آئی؟ اپنی ہی قوم کی غریب جماعت کو ان مہاجنوں نے تباہ کر دیا، ان کی کوڑی کوڑی چھین لی اور شودر بنا دیا، تب یہ دولت جمع ہوئی ہے اور اب بھی اسی سودخواری کی لوٹ سے تباہ ہو ہو کر بہت سے کاشتکار اور مزدور پیشہ شودر بنتے جا رہے ہیں جن کا کوئی پوچھنے والا تک نہیں۔

یہود سودخواروں نے بالخصوص اور سرمایہ داروں نے علی العموم اس وقت دنیا میں بنکنگ کا جال پھیلا دیا ہے اور اس ذریعہ سے دنیا کی تجارت، صنعت، محنت اور دنیا کی پیداوار پر اس طرح قبضہ کرلیا ہے کہ کوئی شخص تجارت، پیداوار، دماغ سوزی اور محنت سے منتفع نہیں ہو سکتا جب تک کہ ان سرمایہ داروں کو اس میں سے کچھ حصہ نہ دے دے۔ اس کا علاج کیا ہے؟ کیا یہ کہ ان کے روپے چھین کر غریبوں میں تقسیم کر دیے جائیں اور ان کو پھر ویسا ہی جال پھیلانے کی اجازت دے دی جائے؟ یا یہ کہ اس جال کو ہمیشہ کے لیے فنا کر دیا جائے، یعنی سودی معاملات کو روک دیا جائے تاکہ ہمیشہ کے لیے

.... ان مظالم کا قطعی سدباب ہو جائے ؟

بعض اصحاب جو اقتصادیات سے قطعاً نابلد ہیں، کہا کرتے ہیں کہ ایسی سودخواری جس میں سود زیادہ لیا جائے اور حاجت مندوں یا مفلسوں سے لیا جائے بے شک بری ہے، مگر تاجروں کو جو روپیہ سود پر دیا جائے کہ وہ تجارت کریں یا جو روپیہ بنکوں سے سود کا لیا جائے اس کی برائی کی کوئی وجہ نہیں ہے بلکہ تجارت کی ترقی کا ذریعہ ہے۔ ایسے لوگوں کو شائد معلوم نہیں ہے کہ بنک کا کام کیا ہے؛ اور جو روپیہ بنک سے سود کا ملتا ہے وہ دولت مندوں کا ہوتا ہے یا غریبوں کا۔ بنک کو مدد دینا اپنی قوم اپنے ملک، اور ملک کے غریب طبقے اور چھوٹے تاجروں کو اپنے ہاتھوں سے تباہ کرنے کا ہم معنی ہے۔ بلنک میں روپیہ جمع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے ظالمانہ کام کو وسیع پیمانہ پر جاری کر سکے۔ غریب تاجر، غریب کاشتکار، غریب کاریگر سے بڑی رقمیں سود کی وصول کرے اور ان میں سے ایک حصہ ان لالچی جمع کرنے والوں کو بھی دیتا رہے سود کا روپیہ دولت مندوں کے سرمایہ میں سے نہیں ملتا۔ غریبوں ہی کی جیب سے نکل کر آتا ہے۔

بڑے افسوس کی بات ہے کہ بعض کمزور مسلمان سرمایہ داری کے خلاف بھی ہیں اور ظالم سود خواروں کو دولت مند دیکھ کر سود خواری کے جواز کے خواہشمند بھی ہیں۔ اسلامی تعلیم میں اصلاح کے طالب ہیں، علماء کے اس پرانے خیال پر روتے ہیں کہ انہوں نے سود سے روک کر ہمیں غریب بنا دیا بعض مولویوں کو ملا کر کم از کم بنک کے سود کے جواز کا فتویٰ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں ایسے لوگوں کے خلوص اور نیت پر حملہ نہیں کرنا چاہتا، مگر اس مسئلہ پر مزید غور و فکر کی دعوت دیتا ہوں اگر مسلمانوں میں ہندو کروڑپتی مہاجنوں کی طرح کوئی سود خوار جماعت پیدا نہیں ہوئی تو یہ رونے کی چیز نہیں ہے۔ رونے کی چیز وہ ہوگی کہ غریبوں کو ہم خود لوٹنے لگیں، یا خود نہ لوٹیں مگر لوٹنے والوں کی مدد کریں اور لوٹ کے مال میں حصہ بانٹنے لگیں۔ اگر ہم اس بات کے خواہشمند ہیں کہ ہم میں کروڑپتی

مہاجن پیدا ہوں تو ہمیں یہ بھی پسند کرنا پڑیگا کہ ہم میں تباہ حال شودر بھی پیدا ہوں، کیونکہ کروڑپتی زیادہ تر اپنی ہی قوم کو لوٹ کر کروڑپتی بنتے ہیں۔

الغرض دولت اور سرمایہ دنیا کے تمام کاموں کا ایک ضروری جزو ہے۔ تجارت، صنعت و حرفت، علمی ترقی، فن کی تکمیل، سب کے لیے سرمایہ کی ضرورت ہے۔ اسلام نے محنت اور جفاکشی کی طرح سرمایہ کو بھی حصول انتفاع کا ذریعہ تسلیم کیا ہے لیکن جفاکشی اور محنت کرنے والا جس طرح نفع کا مستحق ہوتا ہے اسی طرح نقصان کا بھی ذمہ دار ہوتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح سرمایہ دار کو بھی نفع اور نقصان دونوں کا ذمہ دار ہونا چاہیے۔ اگر تبادلہ میں کوئی حصہ بغیر معاوضہ و بدل کے لیا جائے، یا سرمایہ کے عوض صرف مقررہ نفع لیا جائے اور نقصان کا سرمایہ دار ذمہ دار نہ ہو تو ایسا معاملہ ناجائز اور حرام ہوگا۔ نہ کوئی مسلمان خود ایسا معاملہ کر سکتا ہے، نہ ایسی قوم کیساتھ موافقت کر سکتا ہے جو اس طرح کا معاملہ کرے۔

مسلمانوں پر منجملہ اور فرائض کے ایک فرض یہ بھی ہے کہ دنیا سے ایسے ظالمانہ کاروبار کو مٹائیں کیونکہ یہ چیز دنیا کے کمزور طبقہ کی تباہی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

شُکر

از جناب مولوی داؤد اکبر صاحب اصلاحی

شکر ہر صحیح فطرت میں ودیعت ہے کوئی متنفس اس جذبہ سے خالی نہیں ہے۔ ہر دل کی یہ صدا ہے اس لیے اس کی صداؤں سے اعراض کرنا درحقیقت اپنی فطرت سے جنگ کرنا ہے۔ ہمارے باطن کی تمام کائنات اسی چراغ سے روشن ہے اور پھر اسی کا پرتو ہے جو ہماری اس مادی زندگی کی ظلمتوں کو دور کرتا ہے۔ اگر انسان کے اندر یہ جذبہ نہ ہو تو وہ بھی ایک حقیر جانور ہے۔ اسی سے انسان کی وہ اصلی خصوصیتیں ظہور میں آتی ہیں جن کی بدولت وہ دنیا و آخرت کی تمام سرفرازیاں حاصل کرتا ہے۔ قرآن مجید میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام انسانی خصائل اخلاق اور تمام صحیح اعمال و عقائد کا سرچشمہ یہی ہے۔ یہ باب آخرت بھی ہے اور کلید دنیا بھی۔ روح اخلاق بھی ہے۔ اور روح سیاست بھی خلاصہ قرآن بھی ہے اور مقصود سنت نبوی بھی۔ پس جو شخص اس جذبہ سے محروم ہے وہ گویا ہر چیز سے محروم ہے۔ یہ ایک چیز کھو کر اس نے ہر چیز کھو دی۔

اس تمہید کے بعد ہم اجمالاً اس لفظ کی اصل حقیقت کی تشریح کرنا چاہتے ہیں۔

شکر کا مفہوم شکر نام ہے اس جذبۂ محبت کا جو خدا کی صفات ربوبیت و رحمت میں غور کرنے سے پیدا ہوتا ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ شکر نام ہے اس کیفیت کا جو مظاہر قدرت ربانی کے مشاہدہ سے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ اس کیفیت کا پہلا ثمرہ ایمان ہے۔ اگر یہ کیفیت نہ ہو تو دل کا تمام عالم تحسیر ظلمات ہے اور قرآن مجید نے اس حالت کی تعبیر کفر کے لفظ سے کی ہے۔

شکر مبادی دین کا سرچشمہ ہے شکر تمام مبادی دین کا سرچشمہ ہے۔ اسی سے توحید و معاد کے اعتقاد کی

راہ کھلتی ہے اور اسی سے آدمی کو ایمان بالرسالت کے لیے دلیل ہاتھ آتی ہے۔ ذیل میں ہم اس دعوے کی بعض دلیلیں اجمالاً بیان کرنا چاہتے ہیں سورۂ نساء میں ہے:۔

(۱) مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ إِنْ شَكَرْتُمْ وَ اٰمَنْتُمْ وَ كَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا (نساء) اگر تم شکر کرو اور ایمان لاؤ تو اللہ کو تمہیں عذاب دے کر کیا کرنا ہے اللہ قدردان اور سب کچھ جاننے والا ہے

مذکورۂ بالا آیت میں فرمایا۔ إِنْ شَكَرْتُمْ وَ اٰمَنْتُمْ۔ اگر تم نے شکر کیا اور ایمان لائے اس سے معلوم ہوا کہ ایمان کی اصل شکر ہے۔ آدمی میں جب یہ جذبہ زندہ ہوتا ہے تب ہی اس پر ایمان کی راہ کھلتی ہے۔

(۲) قرآن پاک کی موجودہ ترتیب سے بھی ہمارے دعوے کے لیے ایک دلیل ہاتھ آتی ہے ————

قرآن مجید میں سورۂ فاتحہ تمام سورتوں سے پہلے ہے اور اس کے متعلق یہ بالاتفاق تسلیم ہے کہ وہ سورۂ شکر ہے۔ اس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ دین کی تمام تعلیمات کا سنگ بنیاد شکر ہے اسی سے اس کے تمام مبادی پیدا ہوتے ہیں۔ شائد اسی وجہ سے فاتحہ کا نام ام القرآن بھی ہوا۔

تفصیل بالا سے شکر کی مرکزیت ثابت ہوگئی ہوگی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ دینی و دنیاوی ترقیوں میں اس کا کہاں تک دخل ہے؟

شکر دینی و دنیاوی ترقیوں کی اساس ہے قرآن پاک کی متعدد آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ شکر اسلامی زندگی کے لیے سراسر باعث حیات ہے اور اس کا فقدان اس کے لیے ہلاکت و تباہی کا پیش خیمہ ہے۔ صدر اول کے مسلمانوں نے اسی حقیقت کو پاکر ایسی درخشاں ترقی کی کہ اس قسم کا عروج چشم فلک نے کبھی نہ دیکھا تھا لیکن جب وقت سے مسلمانوں نے اس عظیم الشان اصل کو چھوڑا ان کی رفعت کا قصر آناً فاناً میں ڈھ گیا۔ نہ تو ان کے پاس تخت و تاج ہی رہا، اور نہ اخلاقی طاقت ہی کے وہ

مالک رہ گئے۔ اسی پر معاملہ ختم نہیں ہوا۔ بلکہ اقوام عالم کی فہرست میں ان کا نام پست ترین قوموں کے سلسلہ میں آنے لگا ایسا کیوں ہوا؟ اس کا محض ایک سبب ہے۔ وہ اسی حقیقت کا (جسے شکر سے تعبیر کرتے ہیں) فقدان ہے۔ یہ شاعری نہیں ہے بلکہ حقیقت ثابتہ ہے۔

قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے۔

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ .... (۷۔ ابراہیم)

اور جب اعلان کردیا تمہارے پروردگار نے کہ اگر شکر کرو گے تو تمہیں زیادہ دوں گا اور اگر ناشکری کرو گے تو پھر میرا عذاب بہت سخت ہے۔

اس آیت میں تصریح ہے کہ یہ سنت الٰہی ہے کہ ہر وہ جماعت جس میں شکر کا جذبہ ہوگا وہی انعامات الٰہی سے متمتع ہوگی اور جو اس دولت سے محروم ہوں گے ان کے لیے دنیا میں بھی محرومی ہے اور آخرت میں بھی۔ خدا کا یہ اٹل قانون ہے، اس میں تخلف ناممکن ہے۔ امت مسلمہ پر بھی خدا کی یہ سنت جاری ہوئی۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا۔

ایک دوسرے مقام پر یوں مذکور ہے۔

اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ وَاِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ۔ (۷۔ زمر)

اگر تم ناشکری کرو گے تو خدا تمہاری حمد کا محتاج نہیں ہے وہ اپنے بندوں کے لیے ناشکری پسند نہیں کرتا۔ اور اگر تم اس کی شکر گزاری کرو گے تو اسے وہ تمہارے لیے پسند کرتا ہے۔ کوئی کسی کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔ اس کے بعد اپنے رب کی طرف تمہیں پلٹنا ہے پھر وہ تمہیں تمہارے اعمال کی جزا دے گا۔ اس لیے کہ وہ سینوں کے اسرار سے (بھی) واقف ہے۔

مذکورہ بالا آیت سے یہ ہویدا ہے کہ رضوان آلہی کے حصول کا ذریعہ محض شکر ہے۔ اس کے بغیر نہ تو کسی کی آئندہ زندگی ہی کی تعمیر ممکن ہے اور نہ دنیا ہی میں کوئی نمایاں درجہ حاصل ہو سکتا ہے اس لیے کہ ہر قسم کے امتیازوں کی کلید خدا ہی کے ہاتھ میں ہے۔ وہی جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل و رسوا کر دیتا ہے۔ اور یہ معلوم ہے کہ اس کے تمام امور حکمت پر مبنی ہیں۔ اسی لیے انعامات سے وہی لوگ لطف اندوز ہوں گے جو شکر کی دولت سے مالامال ہوں گے۔ مذکورۂ بالا آیت اس بارے میں حجۃ قاطعہ ہے۔

اوپر کی تشریح سے یہ حقیقت ذہن نشین ہو گئی ہو گی کہ دینی و دنیاوی ترقیوں کا حصول یکسر شکر پر مبنی ہے۔ اس کے بعد اب ہم بتانا چاہتے ہیں کہ انسان ہی کے لیے شکر کی صفت مخصوص نہیں ہے بلکہ کائنات کا ذرہ ذرہ خدا کی حمد و تسبیح میں مشغول ہے۔ قرآن پاک میں متعدد مقامات پر اس کی نغمہ ریزی مذکور ہے۔

سورۂ حدید میں ہے:۔

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۱۔ حدید)

آسمانوں اور زمین میں جتنی چیزیں ہیں سب کی سب خدا کی حمد و تسبیح میں لگی ہوئی ہیں۔

ایک دوسری جگہ یوں مذکور ہے۔

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ...... (تغابن)

آسمانوں اور زمین میں جتنی چیزیں ہیں سب کی سب خدا کی تسبیح کر رہی ہیں اسی کے ہاتھ میں بادشاہت ہے اور اسی کے لیے حمد ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے

ایک دوسرے مقام پر یوں مذکور ہے۔

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ

آسمانوں اور زمین میں جتنی چیزیں ہیں سب کی سب

الْمَلِكِ الْقُدُّوسِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ .... (۱- جمعہ)۔

اس خدا کی تسبیح کر رہی ہیں جو پادشاہ پاک غالب حکمت والا ہے۔

ایک اور مقام پر یوں مذکور ہے۔

وَلَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ لَهُ قَانِتُوْنَ ...... (۲۶- روم)۔

اور اسی کے ہاتھ میں آسمانوں اور زمین کی تمام چیزیں ہیں سب اسی کے سامنے سرنگوں ہیں۔

مذکورہ بالا آیت سے ظاہر ہے کہ خدا کی حمد و تسبیح انسانوں ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی بے پناہ قدرت و جلال کا کلمہ پڑھ رہا ہے۔ کسی کو اس کی عبدیت سے انکار کی تاب نہیں ہے۔ سب کے سب اس کی حمد میں نغمہ ریز ہیں اور غافل انسان کو دعوت دے رہے ہیں کہ وہ بھی اپنا ساز چھیڑے تاکہ دونوں کے نغموں سے آسمان و زمین گونج اٹھیں۔

سورۂ نور میں ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيْحَهُ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ...... (۴۱- نور)

کیا دیکھتے نہیں کہ آسمانوں اور زمینوں میں جتنی چیزیں ہیں سب کی سب خدا کی تسبیح میں لگی ہوئی ہیں اور اڑتے ہوئے جانور پر کھولے ہوئے ہر ایک کو اس کی تسبیح معلوم ہے اور اللہ تعالیٰ جو کچھ وہ کرتے ہیں اس سے خوب واقف ہے۔

ایک دوسری جگہ یوں مذکور ہے۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ .... (۱۵- رعد)

اور اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین میں جتنی چیزیں ہیں صبح و شام برضا و رغبت یا مجبوراً سجدہ کر رہی ہیں۔

مذکورہ بالا آیات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شکر ایسا فریضہ ہے جس سے کائنات کا کوئی ذرہ بھی مستثنیٰ نہیں ہے، ہر ایک طوعاً و کرہاً اس کی عظمت و جلال کے سامنے جبین نیاز جھکانے پر مجبور ہے۔

سورہ رحمٰن میں ہے۔

وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ۔ (۵۔ رحمٰن) اور سورج اور چاند ایک خاص اندازے سے ہیں۔

مذکورہ بالا آیت سے معلوم ہوا کہ شمس و قمر کا ایک خاص مقدار سے اپنے حدود میں چکر لگانا ہی ان کی نماز ہے۔

ایک اور مقام پر اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

سُبْحَانَهُ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يَقُولُونَ عُلُوًّا كَبِيرًا تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلٰكِنْ لَا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ إِنَّهُ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا۔	خدا پاک ہے ان کی افتراپردازیوں سے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے اندر ہے سب اسی کی تسبیح کرتے ہیں اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی تسبیح نہ کرتی ہو لیکن تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے بیشک خدا حلیم اور بخشنے والا ہے۔

(۴۳ - ۴۴ - بنی اسرائیل)

الغرض قرآن پاک میں بے شمار ایسی آیات مذکور ہیں جن سے شکر کی ہمہ گیری اور فطرت کائنات ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اب ہم بتانا چاہتے ہیں کہ آخر یہ جذبہ کیسے پیدا ہوتا ہے؟ قرآن پاک نے اس سوال کا متعدد جگہ جواب دیا ہے۔

شکر کے محرکات قرآن پاک کے استقصاء سے معلوم ہوتا ہے کہ بے شمار مقامات پر خداوند تعالیٰ نے اپنی نعمتوں سے شکر کے وجوب پر استدلال کیا ہے۔

سورۂ نحل میں ہے۔

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِيْ جَوِّ السَّمَآءِ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَا اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ ... (نحل ۷۸-۸۳)

اور اللہ ہی نے تمہاری ماؤں کے پیٹ سے تمہیں نکالا ہے اس حالت میں کہ تم کچھ نہ جانتے تھے اور تم کو کان اور آنکھیں اور دل دیے تاکہ تم شکر ادا کرو۔ کیا دیکھتے نہیں پرندوں کو کہ کیسے فضا میں بندھے ہوئے ہیں ان کو کوئی نہیں سنبھالتا بجز خدا کے۔ ضرور اس میں ایمان والوں کے لیے بڑے بڑے دلائل ہیں۔ اور خدا ہی نے تمہارے لیے رہنے کے لیے گھر بنا دیے ہیں اور اسی نے چوپایوں کی کھال سے تمہارے سفر و حضر کے لیے ہلکے ڈیرے بنا دیے ہیں اور ان کے اُون اور بالوں سے سامان بنا دیا ایک مدت تک کیلیے اور تمہارے لیے اپنی مخلوقات سے سایہ کا سامان کیا اور پہاڑ میں چھپنے کی جگہیں بنا دیں اور بنائے تمہارے لیے ایسے کرتے جو بچاتے ہیں تمہیں گرمی سے اور ایسے کرتے جو بچاتے ہیں لڑائیوں سے، اس طرح وہ اپنی نعمت کا تمہارے لیے اتمام کرتا ہے شاید کہ تم اس کی اطاعت قبول کرو۔ پس اگر وہ روگردانی کریں تو (تجھ کو کچھ پروا نہیں) تجھ پر تو محض تبلیغ ہے۔ یہ خدا کی نعمت پہچان کر اسکا انکار کرتے ہیں اور اکثر ان میں ناشکرے ہیں۔

مذکورۂ بالا آیات سے وجوب شکر کے متعدد پہلو نکلتے ہیں۔

(۱) انسان اپنے وجود میں خدا کا محتاج ہے۔ اس نہج سے بھی اگر غور کیا جائے تو اس میں وجوب شکر کی بہت بڑی دلیل ہے۔

(۲) خداوند تعالیٰ ہی نے انسان کو قوائے مدرکہ سے آراستہ کیا ہے۔ اس لیے ان قویٰ کا ایسا استعمال ہونا چاہیے جس سے خدا کی خوشنودی حاصل ہو۔ اس میں بھی شکر کے وجوب کی بہت بڑی دلیل ہے۔

(۳) دنیا میں جتنی مخلوقات ہیں ان میں سے ہر ایک کی پیدائش میں کوئی نہ کوئی غرض ہے۔ کوئی پانی برسانے پر مامور ہے تو کسی کے ذمہ موسم کا خوشگوار بنانا ہے کسی میں حرارت کا مادہ ہے تو کسی میں برودت کا تو ضرور ہے کہ انسان جو خلاصۂ کائنات ہے اس کی پیدائش کا بھی کوئی اہم مقصد ہو۔ قرآن نے ان کی زندگی کا نصب العین شکر قرار دیا ہے اور یہی انسان کی فطرت بھی ہے اس لیے کہ ہر انسان جس میں نظر و فکر کا مادہ ہے جب وہ اپنے آپ کا اور نظام عالم کا مطالعہ کرے گا تو بے اختیار ہو کر خلاق عالم کے سامنے اپنی جبین نیاز ڈالدے گا۔

ایک اور مقام پر انعامات الہٰی سے شکر پر یوں استدلال کیا گیا ہے :۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِیَ الْفُلْكُ فِیْهِ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۔ (۱۲ - جاثیہ)

خدا ہی نے تمہارے لیے سخر کر دیا سمندر کو تاکہ اس میں کشتیاں چلیں اس کے حکم سے اور تاکہ تم اس کا فضل چاہو اور شاید کہ تم شکر ادا کرو۔

ایک اور جگہ نہایت تفصیل سے خدا نے اپنی نعمتیں یاد دلا کر شکر پر ابھارا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

هُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِیْهِ تُسِیْمُوْنَ یُنْۢبِتُ

خدا ہی نے آسمان سے پانی برسایا ہے جسے تم پیتے ہو اور اسی سے درخت اگتے ہیں جن سے تم چراتے ہو۔

لَكُم بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُونَ وَالنَّخِيلَ
وَالْأَعْنَابَ وَمِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ إِنَّ
فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ وَسَخَّرَ
لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ
وَالنُّجُومُ مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِهِ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ
لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ وَمَا ذَرَأَ لَكُمْ
فِي الْأَرْضِ مُخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ
لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَذَّكَّرُونَ وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ
الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُوا
مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ
مَوَاخِرَ فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِن فَضْلِهِ وَ
لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۔ (۱۰-۱۴ النحل)

تمہارے لیے اگاتا ہے اس سے کھیتی اور زیتون اور کھجوریں اور انگور اور ہر قسم کے میوے۔ اس میں یقیناً ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں نشانی ہے اور اسی نے تمہارے لیے مسخر کر دیا رات اور دن اور سورج اور چاند اور تاروں کو۔ سب اس کے حکم کے ماتحت ہیں ضرور اس میں عقلمند لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ اور جو بکھیرا ہے تمہارے لئے زمین میں جس کے رنگ مختلف قسم کے ہیں۔ اس میں سبق حاصل کرنے والوں کے لیے بڑی نشانی ہے۔ اور اسی نے دریا کو تمہارے لیے مسخر کر دیا تاکہ اس سے تازہ گوشت کھاؤ اور اس سے زیور نکالو جسے تم استعمال میں لاتے ہو اور تم دیکھتے ہو اس میں کشتیاں جو پھاڑتی ہوئی چلتی ہیں تاکہ تم خدا کے فضل کی تلاش کرو اور تاکہ تم شکر ادا کرو۔

دیکھیے مذکورہ بالا آیات میں جو چیزیں مذکور ہیں کیا ان میں سے کسی ایک پر بھی انسان کا تصرف ہے؟ کیا انسان کے حکم سے پانی برس سکتا ہے؟ اور کیا زمین اس کی خواہش پر اس کے لیے اپنے خزانے اگل سکتی ہے؟ اور کیا درخت میں اس کے اشارے سے پھل آ سکتا ہے؟ اور کیا اختلاف لیل و نہار میں اسے ذرا بھی دخل حاصل ہے؟ غالباً ہر شخص بلا تردد ان سوالات کا جواب ان الفاظ میں دے گا کہ "یہ ضرور ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ ہماری ہی فائدہ رسانی کے لیے ہے۔ اس لحاظ سے یہ پورا کارخانہ ہمارا خادم ہونے کی حیثیت رکھتا ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ اس پورے کارخانہ کی

باگ کسی اور ہی طاقت کے ہاتھ میں ہے جس کے حکم کے بغیر آسمان و زمین میں کوئی انقلاب نہیں ہو سکتا۔
پس انسان کی بے بسی کا جب یہ عالم ہے تو پھر اسی کا شکر بھی ہونا چاہیے جس نے یہ سب کچھ اسے عطا کیا ہے
اس لیے نہیں کہ وہ شکر کا بھوکا ہے بلکہ اس لیے کہ ہم اس کی نوازشوں کے زیادہ سے زیادہ مستحق
ہو سکیں۔ مذکورۂ بالا آیات میں یہی حقیقت بیان کی گئی ہے۔

تفصیل بالا سے یہ حقیقت محتاج بیان نہ رہی کہ اللہ تعالیٰ کی بے پایاں مہربانی مقتضی ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ اس کا شکر ادا کرے۔ اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ شکر گزاروں کے لیے خدا کی طرف سے دنیا میں بھی تائید ہوتی ہے اور آخرت میں بھی۔ دونوں جگہ وہی اس کے الطاف کے مستحق ہوں گے جو اس کا شکر بجا لائیں گے۔

شاکروں کے ساتھ خدا کی تائید دنیا و آخرۃ میں۔ قرآن پاک کی متعدد آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ خدا کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہیں ان کی تائید دنیا میں بھی ہوتی ہے اور آخرت میں بھی وہی نعمائے الٰہی سے محظوظ ہوں گے۔

سورۂ قمر میں مذکور ہے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطٍ بِالنُّذُرِ۔ اِنَّا اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا اِلَّا اٰلَ لُوْطٍ نَجَّيْنٰهُمْ بِسَحَرٍ نِعْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ شَكَرَ .... (۳۳-۳۵) (قمر)	لوط کی قوم نے تنبیہوں کو جھٹلایا۔ ہم نے ان پر پتھراؤ کیا۔ بجز آل لوط کے کہ ہم نے انھیں سحر کے وقت نجات دی ایسا بطور احسان کے اپنی طرف سے ہم نے کیا اور ہم اس طرح شکر گزاروں کو جزا دیتے ہیں۔

مذکورہ بالا آیات میں تصریح ہے کہ لوط علیہ السلام کی قوم ناشکری کے جرم میں ہلاک کر دی گئی اور لوط اور ان کے اتباع پر محض ان کی شکر گزاری کی برکت سے آنچ تک نہ آئی۔ بلکہ یہ انھیں کی طرف سے خدا نے پرستاران باطل سے انتقام لیا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو جماعت جذبۂ شکر سے

معمور ہوگی) اس کے دشمنوں کا خدا بھی دشمن ہوگا۔ اور اس کے دوستوں کا خدا بھی دوست ہوتا ہے

ایک اور جگہ یوں مذکور ہے۔

وَحَمَلْنَاهُ عَلَىٰ ذَاتِ أَلْوَاحٍ وَدُسُرٍ تَجْرِي بِأَعْيُنِنَا جَزَاءً لِّمَن كَانَ كُفِرَ ۔۔۔۔۔۔ (۱۳-۱۴، قمر)

اور ہم نے اسے اٹھا لیا ایک تختوں اور میخوں والی پر جو چلتی تھی ہماری نگرانی میں۔ اس شخص کو جزا دینے کے لیے جس کا انکار کیا گیا تھا۔

ان آیات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ قوم نوح کی تباہی بھی اسی لیے عمل میں آئی کہ وہ کفران نعمت کے جرم کی مرتکب ہوئی۔

جس طرح دنیا میں شاکروں کے ساتھ خدا کی عنایت شامل حال ہوتی ہے اسی طرح آخرت میں بھی ان کے لیے سرخروئی حاصل ہوگی۔

سورہ آل عمران میں ہے۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَن تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ كِتَابًا مُّؤَجَّلًا ۗ وَمَن يُرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَن يُرِدْ ثَوَابَ الْآخِرَةِ نُؤْتِهِ مِنْهَا ۚ وَسَنَجْزِي الشَّاكِرِينَ ۔ (۱۴۵۔ العمران)

اور کسی پر موت نہیں طاری ہو سکتی۔ الا یہ کہ اذن الٰہی ہو جائے (جس کے لیے ایک وقت ٹھیرا دیا گیا ہے۔ جو دنیا کا ثواب چاہتا ہو اسے ہم دنیا ہی کا ثواب دیں گے اور جو کوئی آخرت کے ثواب پر نظر رکھتا ہے اسے آخرت کا ثواب دیں گے اور ہم شکر گذاروں کو ان کی نیک عملی کی جزا ضرور دیں گے

دیکھیے مذکورۂ بالا آیت میں تصریح ہے کہ شاکر بندوں کے لیے خدا کے حضور میں بڑے بڑے انعامات ہیں۔ ذیل کی آیات اس بارے میں حجۃ قاطعہ ہیں ملاحظہ ہوں۔

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِّلَّهِ حَنِيفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ شَاكِرًا لِّأَنْعُمِهِ

بلاشبہ ابراہیم ایک پوری امت تھا اللہ کے آگے جھکا ہوا تھا ہرگز مشرکین میں سے نہ تھا وہ اللہ کی

اِجْتَبٰهُ وَهَدٰهُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ وَاٰتَیْنٰهُ فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ - (نحل ۱۳۰، ۱۲۲)

نعمتوں کا شکر بجا لانے والا تھا اللہ نے اسے برگزیدگی کے لیے چن لیا اور سیدھے راستہ کی ہدایت دی اسے دنیا میں بھی ہمنے بہتری دی اور آخرت میں بھی، اور بلاشبہ آخرت میں اس کی جگہ صالح انسانوں میں ہو گی۔

مذکورہ بالا آیات میں تصریح ہے کہ حضرت ابراہیم کو اسی شکر ہی کی بدولت دنیا و آخرت دونوں میں سربلندی و سرخروئی حاصل ہوئی۔

انبیاء کرام کی بشریت و ملکوتیت

(از جناب مولوی محمد ایوب صاحب عثمانی۔ اورنگ آباد ضلع گیا)

اگرچہ دائرۂ بشریت میں نبوت و رسالت کا وجود انسانی کسب و اکتساب کا نتیجہ نہیں ہے اور انبیاء و رسل کا بزرگ وجود عام مجمع انسانی سے بہت بلند ہوتا ہے لیکن اس اعتبار سے کہ تمام انسانی اوصاف ان میں موجود ہوتے ہیں اور ان بزرگوں کی جماعت نسل انسانی سے خارج نہیں ہوتی، یہ تسلیم کرنا ضروری ہوتا ہے کہ نبیوں اور رسولوں کی جماعت میں کا ہر نبی و رسول بشر تھا۔ اگر قرآن ان کی بشریت کا ذکر نہ بھی کرتا تو یقیناً ان کی بشریت ثابت تھی لیکن باوجود اسکے قرآن نے ان کے بشر ہونیکی تصریح کی ہے تاکہ ان کی طرف الوہیت کو نسبت دینے کا شائبہ تک نہ رہے۔ چنانچہ تمام نبیوں کے سرتاج نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے اپنے بشر ہونے کا اعلان فرمائیں۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (۱۶-۳) آپ لوگوں سے کہہ دیجیے کہ میں بس ایک بشر ہوں جیسے تم ہو۔

جب اعجاز قرآن اور سیرت مطہرہ نبوی سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت مبرہن ہوجاتی ہے اور انکار کی مجال باقی نہیں رہتی تو منکرین رسالت ان دلائل و براہین کے سامنے مبہوت و متحیر ہوکر آپ پر ایمان لانے کے لیے خوارق العادہ چیزوں کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں۔ اسپر آپ کو حکم ہوتا ہے کہ آپ اپنے بشر ہونے کا اعلان فرمائیں۔

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا اور کافروں نے کہا کہ ہم تو تیری بات نہ مانیں گے

مِنَ الْاَرْضِ يَنْبُوْعًا اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ	جب ہوگا کہ تو ہمارے لیے زمین کے اندر سے ایک
مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ عِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ	چشمہ جاری کرے یا کھجور اور انگور کا کوئی باغ ہو اور تو
خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ	اس کے بیچ میں نہریں بہائے یا جیسا کہ تیرا دعویٰ
كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ	ہے ہم پر آسمان کے ٹکڑے گرائے یا اللہ اور فرشتوں
بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا اَوْ يَكُوْنَ لَكَ	کو ہمارے سامنے لا کھڑا کرے یا تیرے لیے سونے کا
بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِى السَّمَآءِ	کوئی گھر ہو یا تو آسمان پر چڑھ جائے اور ہمیں تیرے
وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا	آسمان پر چڑھنے کا یقین بھی جب ہوگا کہ تو ہمارے
كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّىْ هَلْ	پاس ایک کتاب اتار لائے جس کو ہم پڑھیں اے رسول
كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (بنی اسرائیل ۱۰)	تو ان سے کہدے کہ میرا خدا تمام عیبوں سے پاک ہے

بھلا میں اس کے سوا اور کیا ہوں کہ ایک انسان ہوں (خدا کا) پیغام پہونچانے والا۔

قرآن میں جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی خبر دی گئی اور آپ کے لیے موت اور قتل کی دو انسانی صفتیں بیان کی گئی ہیں جو بشری صفات میں سے ہیں:

مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ	محمد صرف ایک رسول ہیں ان سے پہلے اور رسول
قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاِئْنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ	گذر چکے ہیں کیا اگر وہ قضا کر جائیں یا قتل کر دیے
انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ (آل عمران رکوع)	جائیں تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟

حضرت مسیح علیہ السلام اور ان کی والدہ ماجدہ کے متعلق جاہلوں نے الوہیت کا جو اعتقاد گھڑ لیا تھا اس کی تردید کے لیے پرزور طریقہ سے کہا گیا کہ وہ دونوں انسان تھے اور انسانوں کی طرح کھانا کھاتے تھے۔

مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ	مریم کا بیٹا مسیح بس ایک رسول تھا اس سے پہلے

مِنۡ قَبۡلِهِ الرُّسُلُ وَاُمُّهٗ صِدِّيۡقَةٌ ؕ اور بھی رسول گذر چکے ہیں اور اس کی ماں صدیقہ تھی
كَانَا يَاۡكُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ (مائدہ ع ۱۰) اور یہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔

کفار کہتے تھے کہ رسول کسی فرشتے کو ہونا چاہیے ان کے نزدیک یہ بڑے اچنبھے کی بات تھی کہ انہی جیسا ایک انسان پیغمبر ہو۔ اس لیے جب آنحضرت صلعم نے ان کے سامنے اپنی نبوت کا دعوی کیا تو انہوں نے آپ کے دعوے کو ماننے سے محض اس بنا پر انکار کر دیا کہ آپ انسان تھے اور معمولی انسانوں کی طرح چلتے پھرتے اور کھاتے پیتے تھے:۔

وَقَالُوۡا مَالِ هٰذَا الرَّسُوۡلِ يَاۡكُلُ الطَّعَامَ وَيَمۡشِىۡ فِى الۡاَسۡوَاقِ ؕ لَوۡلَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡهِ مَلَكٌ فَيَكُوۡنَ مَعَهٗ نَذِيۡرًا ۙ اَوۡ يُلۡقٰٓى اِلَيۡهِ كَنۡزٌ اَوۡ تَكُوۡنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاۡكُلُ مِنۡهَا ؕ وَقَالَ الظّٰلِمُوۡنَ اِنۡ تَتَّبِعُوۡنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسۡحُوۡرًا ۔ (فرقان ۱)

اور کافروں نے کہا کہ یہ کیسا رسول ہے جو کھاتا پیتا ہے، اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟ اس کے پاس کوئی ایسا فرشتہ کیوں نہ اتارا گیا جو اس کے ساتھ رہ کر لوگوں کو ڈراتا یا اس کے پاس غیب سے کوئی خزانہ اترتا یا اس کے پاس کوئی باغ ہوتا جس میں سے وہ کھاتا اس بنا پر ظالموں نے مسلمانوں سے کہا کہ تم لوگ تو ایک ایسے شخص کی پیروی کر رہے ہو جس پر جادو کر دیا گیا ہے۔

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اس اعتراض کا جواب یہ بتایا جاتا ہے کہ کھانا کھانا اور بازاروں میں چلنا پھرنا صرف آپ ہی کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ آپ سے پہلے بھی جتنے پیغمبر مبعوث ہوئے ہیں سب کھانا کھانے والے اور بازاروں میں چلنے پھرنے والے لوگ ہی تھے:۔

وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا قَبۡلَكَ مِنَ الۡمُرۡسَلِيۡنَ اِلَّاۤ اِنَّهُمۡ لَيَاۡكُلُوۡنَ الطَّعَامَ وَيَمۡشُوۡنَ فِى الۡاَسۡوَاقِ ؕ (فرقان ع ۲)

اور تجھ سے پہلے ہم نے جتنے پیغمبر بھیجے وہ سب بھی کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے۔

اور کافروں کا یہ جو خیال تھا کہ بھلا انسان کیسے نبی ہو سکتا ہے تو اس کی تردید میں فرمایا گیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی جتنے پیغمبروں کو ہم نے بھیجا وہ سب انسان تھے اور ان میں کوئی بھی فرشتہ نہ تھا اور نہ ان کا جسم کھانا کھانے سے بے نیاز تھا اور نہ وہ ہمیشہ رہنے کے لیے پیدا کیے گئے تھے۔

وَمَا اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْۤ اِلَیْهِمْ فَاسْئَلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا یَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِیْنَ۔ (انبیاء، ع ۱)

ہم نے تجھ سے پہلے جتنے بھی رسول بھیجے ہیں وہ سب مرد آدمی ہوتے تھے جن کے پاس وحی بھیجی جاتی تھی اگر تم کو معلوم نہ ہو تو اہل کتاب سے دریافت کرلو۔ اور ہم نے ان پیغمبروں کا جسم ایسا نہیں بنایا تھا کہ کھانا نہ کھائیں اور نہ وہ ہمیشہ رہنے والے تھے

کفار کا یہ بھی خیال تھا کہ وہ نبی ہی کیا جسے دائمی زندگی حاصل نہ ہو۔ معمولی انسانوں کی طرح بیمار ہونے والا اور قضا کر جانے والا آدمی بھی کہیں نبی ہو سکتا ہے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ اَفَاۡئِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ (انبیاء۔ ۳)

اور ہم نے تجھ سے پہلے بھی کسی بشر کے لیے ہمشگی نہیں بنائی اگر تو مر جائے تو کیا یہ لوگ ہمیشہ رہیں گے؟ موت کا مزہ تو ہر نفس کو چکھنا ہے۔

جب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے رسالت اور دعوت توحید و ایمان کی آواز اہل مکہ کے کانوں میں پہنچی تو جس شئے نے تسلیم رسالت اور قبول ایمان سے ان لوگوں کو باز رکھا وہ یہی خیال تھا کہ آپ بشر ہیں اور اللہ تعالیٰ کسی بشر کو رسول نہیں بنا سکتا۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْۤا اِذْ جَآءَهُمُ

جب لوگوں کے پاس ہدایت بھیجی گئی تو انھیں ایمان لانے سے

اِلْهُدٰىٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۔ (بنی اسرائیل ۱۱) — روکنے والی چیز بجز اس کے اور کچھ نہ تھی کہ وہ کہتے تھے کیا اللہ نے انسان کو رسول بنا بھیجا ہے؟

جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں شریک ہو کر آپ کے تبلیغی احکام اور مواعظ حسنہ کو سنتے انھیں یہ کہہ کر سمجھایا جاتا تھا کہ یہ تمہیں ہو کیا گیا ہے؟ اپنے ہی جیسے ایک انسان کو رسول مانے لیتے ہو؟

وَاَسَرُّوا النَّجْوَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ قَالَ رَبِّيْ يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ (انبیاء رکوع ۱)

ظالموں نے چپکے چپکے کہا کہ یہ شخص تمہی جیسا انسان تو ہے پھر کیا تم جانتے بوجھتے جادو کے اثر میں آرہے ہو؟ رسول نے کہا میرے رب کو آسمان اور زمین کی ہر بات کا علم ہوتا ہے اور وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔ کافروں نے تو یہاں تک کہا کہ یہ سب خواب کی باتیں ہیں بلکہ رسول نے جھوٹ گھڑ لیا ہے بلکہ وہ شاعر ہے اور اگر وہ اپنے دعوے میں سچا ہے تو ہمارے پاس اگلے رسولوں کی طرح کوئی نشانی لائے۔

جب کافروں نے یہ کہہ کر ایمان لانے سے انکار کر دیا کہ انسان کیونکر ہادی و پیغمبر ہو سکتا ہے تو ان کو بتایا گیا کہ پہلی قومیں اسی لیے دنیا و آخرت کے عذاب میں گرفتار ہوئیں کہ انہوں نے رسالت بشری کو تسلیم نہیں کیا تھا اگر تم بھی ویسا ہی کروگے تو تمہارا بھی وہی حال ہوگا جو گذشتہ اقوام و امم کا ہوا۔

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ وَلَهُمْ — کیا تم کو پہلے کافروں کا حال معلوم نہیں کہ انہوں نے اپنے کیے کا ثمرہ چکھ لیا اور اب ان کے لیے سخت عذاب ہے

عَذَابٌ أَلِيمٌ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُ كَانَت تَّأْتِيهِمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَقَالُوا أَبَشَرٌ يَهْدُونَنَا فَكَفَرُوا وَتَوَلَّوا وَّاسْتَغْنَى اللَّهُ وَاللَّهُ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ۔ (تغابن)۔

یہ اس لیے کہ ان کے پاس ان کے رسول کھلی ہوئی دلیلیں لے کر آتے تھے مگر وہ انھیں یہ جواب دیتے تھے کہ کیا اب انسان ہماری ہدایت کریں گے؟ بنا بریں ان لوگوں نے کفر اختیار کیا اور حق سے روگردانی کی پس اللہ نے بھی ان کی کچھ پروا نہ کی اور وہ ہے ہی بے نیاز و لائق حمد۔

قرآن مجید میں قریب قریب تمام انبیاء کے متعلق یہی بیان کیا گیا ہے کہ جاہلوں کو ان پر ایمان لانے سے بس یہی چیز روکتی رہی کہ وہ بشر کو نبی ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔

قَالُوا إِنْ أَنتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا تُرِيدُونَ أَن تَصُدُّونَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا فَأْتُونَا بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ إِن نَّحْنُ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَمُنُّ عَلَىٰ مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَمَا كَانَ لَنَا أَن نَّأْتِيَكُم بِسُلْطَانٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ۔

(ابراہیم ۔ ۲)

کافروں نے اپنے رسولوں سے کہا کہ تم ہماری ہی طرح کے انسان ہو اور تم ہم کو ان بتوں کی پرستش سے روکنا چاہتے ہو جن کو ہمارے باپ دادا پوجا کرتے تھے اس کے لیے تم ہمارے پاس کوئی واضح دلیل لاؤ۔ ان رسولوں نے جواب دیا ہم بھی یقیناً تمہاری ہی طرح کے انسان ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے نوازتا ہے اور ہم تمہارے سامنے بغیر حکم خدا کے کوئی معجزہ نہیں لاسکتے اور اللہ ہی پر تمام مسلمانوں کو توکل کرنا چاہیے۔

حضرت ہود علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو بعث بعد الموت کی خبر دی تو ان سے رؤساء قوم نہایت برہم ہوئے اور تمام لوگوں کو ان کی اطاعت سے یہ کہکر منع کیا کہ وہ تو ایک آدمی ہے جیسے تم آدمی ہو وہ بھی وہی کھاتا پیتا ہے جو تم کھاتے پیتے ہو۔ بھلا وہ کیسے خدا کا رسول ہوسکتا ہے

اور اس کی پیروی کیسے کی جا سکتی ہے؟

وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا	اور قوم ہود میں جو کافر رئیس تھے اور جنہوں نے آخرت
وَكَذَّبُوا بِلِقَاءِ الْآخِرَةِ وَأَتْرَفْنَاهُمْ	کے آنے کی تکذیب کی تھی اور جن کو ہم نے دنیاوی
فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا مَا هَٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ	زندگی میں دولت دی تھی انہوں نے کہا کہ یہ
يَأْكُلُ مِمَّا تَأْكُلُونَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ	شخص تو تم ہی جیسا ایک انسان ہے وہی کھاتا ہے
مِمَّا تَشْرَبُونَ وَلَئِنْ أَطَعْتُم بَشَرًا	جو تم کھاتے ہو اور وہی پیتا ہے جو تم پیتے ہو۔
مِّثْلَكُمْ إِنَّكُمْ إِذًا لَّخَاسِرُونَ أَيَعِدُكُمْ	اگر تم نے اپنے جیسے ایک انسان کی اطاعت کرلی
أَنَّكُمْ إِذَا مِتُّمْ وَكُنتُمْ تُرَابًا وَعِظَامًا	تو تم خاسر ہوگئے۔ کیا وہ تم کو اس سے ڈراتا ہے
أَنَّكُم مُّخْرَجُونَ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ	کہ جب تم مرجاؤ گے اور مٹی اور ہڈیاں بن کر رہ
لِمَا تُوعَدُونَ إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا	جاؤ گے تو پھر پیدا ہوگے عقل سے بعید ہے عقل سے بعید ہے
الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ	جس سے تم کو ڈرایا جاتا ہے۔ جو کچھ ہے وہ یہی ہماری
بِمَبْعُوثِينَ إِنْ هُوَ إِلَّا رَجُلٌ افْتَرَىٰ	زندگی ہے ہم میں کوئی مرتا ہے اور کوئی پیدا
عَلَى اللَّهِ كَذِبًا وَمَا نَحْنُ لَهُ بِمُؤْمِنِينَ۔	ہوتا ہے ہم موت کے بعد پھر زندہ نہ ہوں گے۔
(مومنون - ۳)	یقیناً اس شخص نے اللہ پر جھوٹ تہمت باندھی ہے
	اور ہم ہرگز اس کو سچا باور نہ کریں گے۔

حضرت صالح علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو اپنی رسالت کی خبر دی اور ان کو اتقا و اطاعت کا پیغام سنایا تو ان کی قوم نے ان سے جو کچھ کہا وہ یہ تھا۔

قَالُوا إِنَّمَا أَنتَ مِنَ الْمُسَحَّرِينَ مَا أَنتَ	کافروں نے کہا کہ یقیناً تجھ پر کسی نے جادو کر دیا ہے
إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا۔ (شعرٰی ع ۸)	تو تو ہماری طرح کا ایک آدمی ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو وعظ و نصیحت کی تو اس کا اثر یہ ہوا کہ دنیا میں جو لوگ ہیچ سمجھے جاتے تھے انہوں نے تو ایمان قبول کر لیا مگر امیروں اور رئیسوں نے ایمان لانے سے روگردانی کی اور کہا کہ یہ ایک معمولی آدمی ہے اس سے اس کا مقصد ناموری حاصل کرنا ہے اگر واقعی اللہ تعالیٰ کو ہماری رہبری مقصود ہوتی تو کسی فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتا۔ یقیناً اس آدمی کا دماغ ماؤف ہوگیا ہے۔

وَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ۔ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌ بِهٖ جِنَّةٌ (مومن-۲)

اس کی قوم کے رئیس کافروں نے کہا کہ یہ تو تمہاری ہی طرح کا ایک انسان ہے جو تم پر برتر ہو کر رہنا چاہتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کوئی رسول بھیجنا چاہتا تو ملائکہ کو بھیجتا۔ (انسان کا نبی ہونا) یہ تو ہم نے اپنے پچھلے بزرگوں سے کبھی سنا نہیں۔ یقیناً یہ شخص جنون میں مبتلا ہے

حضرت شعیب علیہ السلام نے اصحاب الایکہ کو احکام الٰہی کی تبلیغ کی تو آپ کو یہ جواب دیا گیا:-

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ وَمَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا۔ (شعراء ع ۱۰)

کافروں نے کہا یقیناً تجھ پر کسی نے جادو کر دیا ہے، ورنہ تو ہمارے ہی جیسا ایک انسان ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے برادر ہارون علیہ السلام کے ساتھ فرعون اور اس کے ارکان دولت کے پاس دعوت ایمان و توحید کی تبلیغ کے لیے گئے تو ان لوگوں نے ایمان لانے سے انکار کر دیا اور یہ کہا کہ یہ دونوں تو ہمارے ہی جیسے دو انسان ہیں بلکہ ان کی قوم تو ہماری غلام ہے

فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ (مومن ع ۳)

فرعون اور اس کے لوگوں نے کہا کیا ہم ان دو آدمیوں پر ایمان لائیں جو ہماری ہی طرح کے ہیں اور

ان دونوں کی قوم کے لوگ ہمارے غلام ہیں۔

قرآن میں کس سادگی کے ساتھ نبی کی جگہ بشر کا لفظ اختیار کیا گیا ہے جہاں یہ کہا گیا ہے کہ کسی نبی کو یہ حق نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کو کتاب اور حکم اور نبوت کی نعمت بخشے اور وہ لوگوں کو بندۂ خدا ہونے کے بجائے اپنی بندگی کا حکم دے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللّٰهِ وَلَٰكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ (آل عمران ۱۶)	کسی بشر کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ جب اس کو کتاب اور سمجھ اور پیغمبری دے تو وہ لوگوں سے یوں کہنے لگے کہ تم میرے بندے بن جاؤ بلکہ وہ تو یہ کہیگا کہ تم سب اللہ والے بن جاؤ اس سبب سے کہ تم لوگ کتاب کی تعلیم دیتے ہو اور کتاب کو پڑھتے ہو

قرآن میں انسان کے اس قدیم جاہلانہ خیال کا کہ رسول کو فرشتہ ہونا چاہیے صرف مختلف پہلوؤں سے جواب ہی نہیں دیا گیا ہے بلکہ اس کے سامنے اس حقیقت کو بھی ہویدا کیا گیا ہے کہ نبیوں اور رسولوں کے ارسال سے مقصد احکام الٰہی کی تبلیغ اور مرسل الیہم کی تعلیم و تربیت ہے اور اس مقصد کا حصول اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ انسانوں کے پاس انسان ہی رسول بن کر آئے؟ اگر یہ نہ ہو تو ارسال رسل کا مقصد فوت ہو جائے۔ چنانچہ منکرین نبوت نے جب یہ سوال اٹھایا کہ

أَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَسُولًا ؟	کیا اللہ نے انسان کو رسول بنا کر بھیجا ہے؟
لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ؟	اس کی تصدیق کے لیے اس پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں بھیجا گیا
مَا هٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ ۔	یہ شخص تو تمہاری ہی طرح کا ایک آدمی ہے۔
لَوْ شَاءَ رَبُّنَا لَأَنْزَلَ مَلَائِكَةً ۔	اگر ہمارا خدا کوئی رسول بھیجنا چاہتا تو فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتا

تو ان سب کے جواب میں یہ فرمایا گیا:-

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّ لَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ۔ اگر ہم فرشتہ کو نبی بناتے تب بھی اس کو آدمی ہی بناتے اور جامۂ انسانیت کی ان تمام خصوصیات سے اس کو آراستہ کرتے جو عام انسانوں میں پائی جاتی ہیں۔

یعنی فطرت کا اقتضا یہی ہے کہ انسان کی ہدایت کے لیے انسان ہی کو رسول ہونا چاہیے۔ حتی کہ اگر فرشتہ کو رسول بنایا جاتا تو اس کو بھی ان تمام تعینات و تقیدات اور ان تمام کمزوریوں سے جو انسان کے ساتھ لگی ہوئی ہیں آلودہ کر دیا جاتا تاکہ وہ انسانی دائرے میں رہ کر خدا کے قانون کی اطاعت کر کے بتائے۔ ایک دوسری جگہ منکرین نبوت بشری کے اسی اعتراض کا اس طرح جواب دیا گیا ہے۔

قُلْ لَّوْ كَانَ فِی الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا۔ (۱۵-۱۱) اگر اس زمین پر بجائے انسانوں کے فرشتے آباد ہوتے تو ہم البتہ ان پر آسمان سے کسی فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتے۔

مطلب بالکل صاف ہے کہ تبلیغ احکام دو متضاد جنسوں میں ناممکن ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ہر نبی اسی قوم کے اہل زبان سے بھیجا گیا ہے جس قوم کی تبلیغ کے لیے وہ آیا ہے جیسا کہ قرآن میں ہے۔

مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ ہم نے ہر ایک رسول کو اسکی قوم کی زبان میں بھیجا۔

قوم عرب کے سامنے جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کی آواز بلند کی اور قریش کے لوگوں نے آپ پر ایمان لانے سے انکار کر دیا تو ان کو سمجھایا گیا کہ یہ رسول تمہاری ہی جنس کا آدمی ہے، قریش سے ہے اس کو تمہارے ساتھ بہت ہی الفت و محبت ہے یہ تم کو ہلاکت و بربادی سے بچانا چاہتا ہے۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ تمہارے پاس ایک رسول آیا ہے جو تمہاری ہی جنس سے ہے

عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم ہے تمہاری سختی اس پر گراں ہے وہ تم پر جان دینے والا ہے
بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ (توبہ آخر) دینے والا ہے مسلمانوں پر بڑا ہی مہربان نہایت رحم والا ہے

غرض کہ یہ امر بلاشک وشبہ ثابت ہے کہ انبیائے کرام بشر تھے اور تمام بشری اوصاف ان میں موجود تھے جس نے قرآن پڑھا ہے وہ تو کسی طرح اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ البتہ اس کے ساتھ یہ ماننا بھی ضروری ہے کہ نبیوں اور رسولوں میں وہ خصائص بھی ضرور موجود تھے جن سے عام انسان یقیناً محروم ہیں۔ مثلاً نزول وحی، ملائکہ رحمٰن سے ملاقات وگفتگو، واقعہ معراج، اور آپؐ کا یہ فرمانا کہ میری آنکھیں سوتی ہیں دل نہیں سوتا اور یہ کہ میں تمہاری ہیئت کے مشابہ نہیں ہوں مجھکو میرا رب کھلاتا اور پلاتا ہے۔ علاوہ بریں گوناگوں معجزات کا ظہور جن سے عام انسان محروم ہیں اور ان کے ہر قول وفعل کا وحی الٰہی کے مطابق ہونا۔

مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ان خصائص نبویہ کے باعث ہم ان کی بشریت کا انکار کر دیں زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کا باطن عام انسانوں کے باطن سے بہت بلند تھا ان کی پاک روحانیت عام لوگوں کی روحانیت سے بہت قوی تھی اور کیوں نہ ہو۔ غیر نبیوں کا کمال ان کے کسب واکتساب کا نتیجہ ہوتا ہے اور حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی روحانی چمک خاص مبدأ فیاض کی عطا کردہ ہوتی ہے اس معنی کو دوسرے الفاظ میں اگر ہم اس طرح ادا کریں تو غالباً غلط نہ ہوگا کہ انبیاء کرام چونکہ خالق ومخلوق کے درمیان وسائط کی حیثیت رکھتے تھے ان کا کام یہ تھا کہ وہ خدائے قدوس کے ہر ایک حکم وخبر اور وعدہ وعید کو اس کے بندوں تک پہنچائیں اور اسی لیے وہ رسول مقرر کیے گئے تھے لہٰذا وہ اپنی ظاہری جسمانیت میں خالص انسان تھے اور ان کے باطن کو ملکوتیت اور ملاء اعلیٰ سے نہایت گہرا لگاؤ تھا یہ اس لیے کہ اگر وہ اپنے ظاہر وباطن دونوں کے لحاظ سے معمولی انسان ہوتے تو ان پر وحی رب کا نزول کس طرح ہوتا اور ملائکہ رحمٰن سے ملاقات

و گفتگو کیونکر ہوتی اسی طرح اگر ان کا ظاہر و باطن دونوں ملک و ملاء اعلیٰ سے متعلق و مرتبط ہوتا تو اپنے غیر جنس کو تبلیغ احکام کس طرح کرتے یہی سبب ہے کہ قرآن نے جہاں ان کی بشریت کی تصریح کی وہاں ان کی اس خصوصیت کو بھی بیان کر دیا جو ان کا روحانی و باطنی وصف تھا مثلاً انما انا بشر کے ساتھ یوحیٰ الیّ کی قید بھی لگادی گئی تاکہ معلوم ہو کہ آپکا باطن نزول وحی الٰہی کی صفت کیساتھ موصوف تھا جس سے عام لوگ محروم ہیں۔ کافروں نے خوارق و مستحیلات کا سوال کیا اور اس کے جواب میں آپ کو اپنی بشریت کے اعلان کا حکم دیا گیا تو اس کے ساتھ رسالت کا وصف بھی لایا گیا اور یہ کہا گیا قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا۔ اسی طرح آپ سے پہلے جو نبی گذر چکے تھے جب ان کی بشریت کا ذکر کیا تو ان میں بھی اس وصف خاص کو ظاہر کیا گیا جیسے کہ اس آیت سے صاف ظاہر ہے وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ اور پھر قرآن میں ان کے معجزات بھی ذکر کیے گئے ہیں جن کا شمار خصائص نبویہ میں ہے اور وہ نبیوں اور رسولوں کے سوا کسی دوسرے کا حصہ نہیں۔

غرض مندرجہ بالا تصریحات سے عوام کے وہ غلط خیالات اور اوہام قطعاً دفع ہو جاتے ہیں جو عام پیغمبروں اور خصوصاً آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نسبت انہوں نے قائم کر رکھے ہیں۔ اور اس سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ تمام انبیاء کرام اور جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اسی نوع انسانی کے افراد تھے جس کے افراد ہم آپ سب انسان ہیں البتہ ہمارے اور ان کے درمیان فرق اور عظیم الشان فرق اس لحاظ سے ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ نبی و رسول تھے اور اسی نبوت و رسالت کی بنا پر ان کے باطن کو ملاء اعلیٰ سے خاص تعلق و لگاؤ تھا لیکن اس تعلق کا یہ معنیٰ نہیں کہ وہ حقیقۃً ملک ہی تھے۔ قرآن نے جس طرح ان کے بشر اور نبی ہونے کو بیان کیا اسی طرح وہیں کیساتھ ان کے ملک ہونے کی نفی بھی کر دی ہے۔

متاع کارواں

از "سارباں"

[ذیل کا مضمون ماہ شوال کی اشاعت کے لیے رکھا گیا تھا۔ مگر رمضان اور کثرت کار نے مل جل کر ایڈیٹر کو بیماری کے سرے پر پہنچا دیا ہے۔ لہٰذا دوسرے مضامین کو ملتوی کر کے اسی پرچے میں اسے شایع کیا جا رہا ہے۔]

بصارت کے ساتھ بصیرت رکھنے والوں کی نگاہوں سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ وہ محکم چٹان جس کی بنا پر ایک قوم دنیا میں اپنی ہستی کو قائم رکھ سکتی ہے، اور دنیا کی ہر وہ رو جو اسے اپنے ساتھ بہالے جانے کے لیے بڑھے، اس سے ٹکرا کر نامراد رہ جاتی ہے، اس قوم کی قوت ایمانیہ ہے جس قدر یہ قوت زیادہ ہوگی اسی قدر وہ قوم دنیا کے ہر سیلاب کا مقابلہ کرنے کے قابل ہوگی۔ قوت ایمانی سے مراد دراصل ایمان کی قدر و قیمت ہے۔ اور چونکہ یہ ایک خارجی شے نہیں بلکہ قلبی کیفیت کا نام ہے اس لیے ایمان کی قیمت کوئی باہر کا خریدار مقرر نہیں کر سکتا بلکہ خود بیچنے والا ہی اس کی قیمت مقرر کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کے نزدیک یہ اتنی حقیر شے ہو کہ وہ اسے ایک روٹی کے ٹکڑے کی خاطر بلا دریغ بیچ ڈالے۔ اور دوسرے کے نزدیک یہ متاع اتنی گراں بہا ہو کہ خدائے ارض و سما سے ورے کوئی گاہک اس کی نگاہوں میں جچتے ہی نہیں، اور وہ اگر دونوں جہاں بھی اسے دیدے تو یہ اس شرم کے مارے چپ ہو رہے کہ اب تکرار کیا کریں۔ یہی وہ قوت ہے جس سے مسلمان کے دل میں وہ بے پناہ جذبہ پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ خدا اور رسول کی قائم کی ہوئی تہذیب و ثقافت کو برقرار رکھنے کے لیے ہر بڑی سے بڑی قربانی کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ مسلمان سے جب دنیا کی ہر طاقت دبتی تھی، تو وہ اس کی شمشیر زنی یا نیزہ افگنی کی وجہ سے نہ تھی، بلکہ اس لیے کہ اس کی متاع

ایمان کو کوئی کسی قیمت پر بھی خرید نہیں سکتا تھا

لہذا جن قوموں نے مسلمانوں کو زیر کرنا چاہا، وہ مدت عمر کے تجربہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچیں کہ ان کے ہاتھوں سے تیغ و سنان کا چھین لینا اس قدر مفید اور ضروری نہیں جس قدر کہ ان کے دل دماغ سے متاع ایمان کی قیمت و اہمیت کو کم کر دینا۔ دیگر ممالک اسلامیہ کا ذکر چھیڑ گیا تو یہ داستان بہت طویل ہو جائے گی۔ اس لیے سردست ہم صرف اتنا دیکھیں گے کہ ہندوستان کے مسلمان کی نگاہوں میں اس کی متاع ایمان کو ایک جنس کاسد ٹھہرانے کے لیے کیا تدابیر عمل میں لائی گئیں۔ اور پھر اس کے بعد ہم دیکھیں گے کہ آج اس متاع کو چھیننے کے لیے کیا کیا حربے استعمال کیے جا رہے ہیں۔

آپ کو شائد معلوم ہوگا کہ ابھی ایسٹ انڈیا کمپنی ایک تجارتی ادارہ سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی کہ سیرام پور میں سب سے پہلا مشن (William Carey) اور اس کے رفقا کار Ward اور (Marshman) کی زیر نگرانی قائم ہو گیا تھا اور انہوں نے ۱۷۹۳ء میں یہاں سب سے پہلا کالج قائم کیا تھا۔ اس وقت تک کمپنی اسے قرین مصلحت نہ سمجھتی تھی کہ ایسی جماعتوں کو کھلم کھلا اپنی سرپرستی میں لے لے۔ کیونکہ حالات اس کی اجازت نہ دیتے تھے۔ اسی لیے جب چارلس گرانٹ نے چاہا کہ پارلیمنٹ سے کمپنی کے دساتیر میں اس شق کا اضافہ کرا لیا جائے تو اسے ناکامی ہوئی، حالانکہ ولیم ولبر فورس جیسا صاحب اثر مدبر بھی اس کا حامی تھا۔ لیکن ۱۸۱۳ء میں جب کمپنی کے چارٹر میں تجدید ہوئی تو اس وقت اس میں اس شق کا اضافہ کرا لیا گیا۔ اس کے بعد مردانہ اور زنانہ مشن سکول ملک کے طول و عرض میں قائم ہو گئے۔ اکیلے چرچ آف انگلینڈ کی طرف سے تقریباً بیس اسکول کھل گئے۔ اور پبلک کے چندہ سے جو انگلستان میں جمع ہوا ۱۸۲۰ء میں کلکتہ میں بشپ چرچ کالج کا افتتاح ہوا۔ ۱۸۴۹ء میں کلکتہ میں سب سے پہلا زنانہ مدرسہ کھولا گیا۔ پریس کے افتتاح نے مشن کی ان تدابیر میں اور بھی تقویت پیدا کر دی۔ پنجاب اور یوپی میں بیسیوں ایسے مرکز قائم ہو گئے جن سے مشن کے لٹریچر کی اشاعت ہوتی تھی۔ سیرام پور مشن کا

پہلا ہفتہ وار اخبار "سماچار درپن"، انہی مقاصد کا آئینہ دار تھا۔

ان عیسائی مشنوں کو "عیسائیت" پھیلانے میں تو کوئی قابل لحاظ کامیابی ہوئی نہیں، البتہ انہیں اس باب میں یقینی کامیابی حاصل ہوگئی کہ لوگوں کے سامنے جب "مذہب" کا نام لیا جائے، تو ذہن ایک ایسے نظریہ کی طرف منتقل ہوجائے جس میں عقل کو کوئی دخل نہ ہو، وہ سرتاسر توہم پرستی، بے دلیل عقیدت، اندھے یقین اور جاہلانہ تعصبات کا مجموعہ ہو، اور عملی دنیا میں وہ ایک قدم بھی انسان کے ساتھ نہ چل سکے۔ ایک طرف تو مذہب کا ایسا تصور رچایا گیا، اور دوسری طرف ڈیوڈ ھیر David Hare جیسے معقولی (Rationalist) نے ۱۸۰۰ء میں پریزیڈنسی کالج، کلکتہ کی بنا ڈالی جسے آزاد خیالی کی تحریک کا گہوارا سمجھنا چاہیے۔ یہ دونوں قوتیں متوازی کام کرتی رہیں۔

اس کے بعد وہ تحریک شروع ہوئی جسے "انگریزی ذریعہ تعلیم کی تحریک" کہتے ہیں۔ ۱۸۲۹ء میں الیگزنڈر ڈف نے چاہا کہ ایک ایسا اسکول کھولا جائے جس میں ذریعہ تعلیم انگریزی ہو۔ اگرچہ اس وقت کی حکومت نے مصلحۃً اس کی مخالفت کی مگر ۱۸۳۹ء میں لارڈ میکالے کو اس امر کی تحقیق کیلئے متعین کیا گیا کہ طریق و ذریعہ تعلیم کیا ہونا چاہیے۔ انگریزی ذریعہ تعلیم کے حامی اپنے خیال کی تائید میں یہ دلیل پیش کرتے تھے کہ اس سے ایک ایسی قوم پیدا ہوجائیگی جو رنگ اور خون کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہوگی لیکن مذاق، خیالات، اخلاق اور ذہنیت کے لحاظ سے انگریزی ہوگی۔ چنانچہ اس دلیل کو وزنی سمجھا گیا، انگریزی ذریعہ تعلیم قرار دی گئی، اور لارڈ ہیسٹنگز نے ۱۸۴۴ء میں اعلان کر دیا کہ سرکاری ملازمت کے لیے انگریزی خوان کو ترجیح دی جائے گی۔

ایک طرف انگریزی زبان کی اشاعت و ترویج کے لیے یہ کچھ کیا جا رہا تھا۔ دوسری طرف عربی اور فارسی کو مٹانے کے لیے بھی کچھ کم قوتیں صرف نہیں ہورہی تھیں۔ مسلمانوں کو لائبریریوں سے خارج کیا جاتا رہا۔ کورٹ آف ڈائریکٹرز نے حکم دیدیا کہ سامی ثقافت کی ریسرچ میں ایک پائی بھی صرف نہ کی جائے۔ ڈاکٹر روئر Roer جو ایشیاٹک سوسائٹی کا د ۱۸۴۷ء سے

۱۸۵۲ء تک انچارج رہا، اور اس کے بعد پال وغیرہ نے یہ ہم کوشش جاری رکھی کہ عربی کی طرف سے توجہات ہٹا کر سنسکرت کی ترویج واحیاء میں تمام روپیہ صرف کیا جائے یہ ظلم وتعصب اس حد تک بڑھ گیا کہ مسلمانوں کے وہ اوقاف تک جو خاص انہیں کیلئے وقف تھے غیر مسلموں کی تعلیم میں صرف ہونے لگے چنانچہ محسن ٹرسٹ ہگلی کا روپیہ ہندو کالج کلکتہ پر صرف ہونے لگا جو قریب قریب سنسکرت کالج تھا۔ اعتماد الدولہ ٹرسٹ کا بھی یہی حال ہوا مسلمانوں کی مذہبی تعلیم اور قدیم زبانوں کی تخریب کی گئی اور ستم یہ کہ ان کے لیے جدید تعلیم حاصل کرنے کے راستہ میں بھی سخت موانع حائل کیے گئے۔ لارڈ ھیسٹنگز کا سرکاری اعلان ہم دیکھ چکے ہیں کہ ملازمتوں میں انگریزی خوان کو ترجیح دیجائے گی۔ لیکن دوسری طرف ڈاکٹر ہنٹر (Hunter) کے الفاظ میں کوئی مسلمان قلی، یا دفتری، یا قلم بنانے والے کی اسامی سے اوپر کسی اسامی کا متوقع نہیں ہو سکتا تھا۔" اور اس طرح اسی ڈاکٹر کے الفاظ میں "بتدریج اسلامی ہندوستان دارالحرب بنا دیا گیا، اور ایک عظیم الشان روایات کی حامل قوم دنیا میں یوں بے وقعت کر کے رکھ دی گئی"، سلطنت چھن گئی۔ جماعت کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ اسلامی قوانین معطل ہو گئے، اسلامی تہذیب کو سہارا دینے والی تعلیم بھی باقی نہ رہی۔ ساری قوم میں جہالت پھیلتی چلی گئی۔ اور اس پر مزید یہ کہ اس کو پیٹ کی مار دی گئی معیشت کے دروازے اس پر ایک کر کے بند کیے گئے اس کو ان لوگوں کے آگے ذلیل وخوار کیا گیا جو کل تک خود اس کے محکوم تھے۔ اور اس کو ایک قلیل مدت کے اندر فقیروں اور قلانچوں کی قوم بنا کر رکھ دیا گیا۔ اس طرح مسلمان کے ایمان کی قیمت گرنی شروع ہوئی اور وہ رفتہ رفتہ مارکیٹ میں ایک جنس فروختنی کی حیثیت سے آگیا۔

الزام دیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے ملاؤں نے انھیں انگریزی پڑھنے سے ۔ ۔ ۔

۱۔ The Indian Musalmans by Dr. Hunter.

اس لیے یہ قوم تعلیم میں پیچھے رہ گئی لیکن مذکورہ صدر واقعات کو سامنے رکھیے اور پھر فیصلہ کیجیے کہ مسلمانوں کو تعلیم سے روکنے والے اُن کے ملّانے تھے یا ایک منظم سکیم تھی ؟" ملانے " (جو یوں بدنام کیے جاتے ہیں) اُن کی تو یہ حالت تھی کہ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ نے فتویٰ دیا تھا کہ "انگریزی پڑھنا، علوم جدیدہ کا حاصل کرنا اسلام کی روایات اور روح کے بالکل مطابق ہے" علماء حضرات کو تو مفت میں مورد الزام ٹھیرایا جا رہا ہے ہمارے اس بیان کی تصدیق کے لیے ذیل کے اعداد و شمار ملاحظہ فرمائیے اور خود نتیجہ اخذ کر لیجیے کہ مسلمان تعلیم جدید سے بھاگتے تھے، یا تعلیم کے دروازے ہی اُن پر مسدود کر دیئے گئے تھے ۱۸۸۲ء میں پنجاب کی تعلیمی رپورٹ کا خلاصہ حسب ذیل تھا۔

	ہندو	مسلمان
ابتدائی تعلیم	۲۳۰۷۴	۱۶۴۴۵
ثانوی (مڈل)	۵۸۰۹	۲۷۴۴
ہائی اسکول	۱۴۱	۴۶
کالج	۹۱	۶
لڑکیاں	۵۷۱	۲۵۷۶

ملاحظہ فرمائیے! ابتدائی حصہ میں تیئس ہزار ہندوؤں کے مقابلہ میں ۱۶ ہزار مسلمان ہیں۔ آگے چلکر مڈل میں پانچ ہزار کے مقابلہ میں دو ہزار رہ جاتے ہیں۔ ہائی اسکول میں قریباً ڈیڑھ سو کے مقابلہ میں چھیالیس (ایک تہائی) اور کالج میں قریب پندرھواں حصہ۔ لڑکیوں کی تعداد بھی قابل غور ہے لیکن مسلمان لڑکیوں کی یہ تمام کثرت صرف ابتدائی مرحلہ میں نظر آتی ہے۔

مختلف سیاسی موانع کے علاوہ مسلمانوں کے راستے میں مذہبی مسئلہ بھی بڑی رکاوٹ پیش کر رہا تھا۔ یہ بات نہیں ہے کہ ان کا مذہب انہیں تعلیم جدید سے روکتا تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ

تمام مدرسے عیسائی مشنریوں کے تھے۔ اور وہاں اُن بچوں کو عیسائیت کی تعلیم دیکر انہیں اسلام سے ورغلایا جاتا تھا۔ چنانچہ ۱۸۶۵ء کا واقعہ ہے کہ حیدر آباد (سندھ) کے ایک مدرسہ میں ایک مسلمان بچے کو عیسائی بنایا گیا، اور دوسرے ہی دن دو سو مسلمان بچوں نے اسکول چھوڑ دیا۔

یہ تھے وہ حالات جن کے تحت یہاں نئی تعلیم کا اجرا ہوا۔ دل میں درد، آنکھوں میں بینائی اور دماغ میں فہم و ادراک رکھنے والے مسلمان اِن حالات کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے اور کلیجہ مسوس کے رہ جاتے تھے لیکن اس وقت بھی خدا کے ایسے بندے موجود تھے جو مسلمانوں کی متاعِ ایمان کو یوں دن دہاڑے لٹتے نہ دیکھ سکتے تھے۔ اللہ کروٹ کروٹ جنت عطا فرمائے حضرت شاہ ولی اللہ رح اور ان کے خاندان کو (علیہم الرحمہ) جنہوں نے ایسے سخت وقت میں اس رو کے خلاف مقابلہ کا عزم کیا۔ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ کی زیرِ قیادت اس تحریک عظیم کی بنیاد پڑی جسے "ترغیب محمدیہ" کہتے ہیں حضرت سید احمد بریلوی، شاہ اسمٰعیل شہید، شاہ عبدالحی (علیہم الرحمہ) اس تحریک کے علمبرداروں میں سے تھے۔ ہمیں اس وقت اس سے بحث نہیں کہ اس تحریک کے سیاسی گوشے کون کونسے تھے اور اُن کا کیا انجام ہوا، ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ مسلمانوں کے تحفظ تہذیب و ثقافت کے مسئلہ پر اس تحریک کے عواقب کس طرح اثر انداز ہوئے "وہابی تحریک" کے استیصال کے لیے جو افسرِ اعلیٰ (James O'Kineaty) متعین کیا گیا تھا، اُس نے اپنی رپوٹ میں لکھا کہ اِن مذہبی سرفروشوں کا عوام پر اثر اس لیے غالب ہے کہ ہم نے عوام میں تعلیم پھیلانے سے تساہل برتا ہے۔ چنانچہ مسٹر بیلی (Bayley.) ہوم سکرٹری نے گورنمنٹ کی پالیسی بدلنے کے لیے جو خریطہ لکھا اس میں اِس بات کو واضح کر دیا کہ مسلمان انگریزی حکومت میں یقیناً تباہ ہو چکے ہیں لیکن حکومت کی پالیسی میں تبدیلی ہونی ضروری ہے یعنی مطلب یہ تھا کہ ان کی تباہی تو مسلّم ہے لیکن اِس قسم کی تحریکیں جو پیدا

ہوتی جاتی ہیں، ان کے استیصال کے لیے یہ ضروری ہے کہ اب انہیں تعلیم و بجائے نوکریوں کے دروازے اب ان کے لیے کھول دیئے جائیں، تاکہ ان کی "جہالت" جو ابھی تک ان کے دل میں جوش ایمانی کے ولولے زندہ رکھے ہوئے ہے، "علم کی روشنی" میں تبدیل ہو جائے، جس سے عشقِ بلا انگیز پر عقلِ حیلہ جو کا غلبہ ہو جائے۔ چنانچہ اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے اسکول اور کالج کھلنے شروع ہو گئے اور یہ "وحشی" بھی "مہذب" بنا لیے گئے۔ علی گڑھ اور حمایت اسلام لاہور اسی تبدیلی کا ثمرہ تھے۔

ڈیڑھ سو سال کی تاریخ چند اشارات میں بیان نہیں کی جا سکتی، اور تاریخ نگاری اس وقت ہمارے پیش نظر ہے بھی نہیں ہمیں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ مسلمانوں کی متاعِ ایمان کی قیمت گرانے اور پھر اسے سستے داموں خریدنے کے لیے اس سو سال کے عرصہ میں کیا کیا عنوانات قائم کیے گئے تھے جن کا آج یہ اثر ہے کہ ایک نوجوان کو راستہ چلنے میں اپنے جوتے کی ایڑی گھسنے کا تو خیال ہوتا ہے، لیکن ایمان گھٹنے کا کبھی خیال نہیں آتا ہم نے دیکھا ہے کہ جو کچھ اس باب میں کیا گیا ہے وہ چند الفاظ میں یہ ہے کہ:۔

۱۔ مسلمان کو اس کے مذہب سے متنفر یا کم از کم بیگانہ بنا دیا جائے۔

۲۔ معاش کے دروازے اس پر بند کر دیئے جائیں تاکہ روٹی کا سوال اس کے دل و دماغ پر مسلط ہو جائے اور یہی چیز اس کی نگاہ میں سب سے زیادہ گراں قدر بن کر رہے۔

۳۔ اس کی تہذیب و تمدن کی زبان کو مٹا کر اس کی جگہ حاکم قوم کی زبان کو ترویج دی جائے۔

جب یہ ہو جائیگا تو مسلمان کے قلب و دماغ کی کایا پلٹ جائے گی۔ مذہب سے بیگانہ ہو گا تو اس کی مرکزیت فنا ہو جائے گی۔ معاش کے دروازے بند ہوں گے تو روٹی کے ٹکڑے پر اسے خریدا جا سکے گا۔ زبان دوسری رواج پا جائے گی تو اس کے ذریعے سے غیر محسوس طور پر، بتدریج دوسروں کی تہذیب اس کی ذہنیت پر اپنا رنگ جما دے گی، اور جب ذہنیت بدل جائے گی تو سب کچھ بدل جائیگا

یہ ماضی کا قصہ تھا۔ اب ذرا حال کی باتیں سنیے تاکہ مستقبل کی تباہی آپ پر خود بخود کھل جائے۔

آج ہندوستان میں پھر ایک تحریک بڑھ رہی ہے، جس کا مقصد حکومت کرنے والے ہاتھوں کی تبدیلی ہے اور اس تحریک کے بانیوں کو بھی وہی سوال پریشان کر رہا ہے جس نے ان کے پیش رووں کو پریشانی میں ڈالا تھا، یعنی ہندوستان میں ایک قوم ایسی ہے جو اس قدر پس جانے کے باوجود اپنے قومی تشخص کو برقرار رکھنے کا داعیہ رکھتی ہے۔ اور جل کر راکھ ہو جانے پر بھی اس میں ابھی بہت سی چنگاریاں باقی ہیں جو ہر وقت بھڑک سکتی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے بھی اسی ڈھنگ پر سوچنا شروع کیا ہے۔ جس ڈھنگ پر کبھی ان کے آقاؤں نے سوچا تھا اور خوب سوچ سمجھ کر گذشتہ ڈیڑھ سو سال کی تاریخ سے سبق حاصل کر کے انہوں نے بھی مسلمان کی شخصیت کے استیصال کے لیے بالآخر وہی تین عنوان قائم کیے ہیں جو اس سے پیشتر وضع کیے گئے تھے کہ :- ؎

نہ ستیزہ گاہ جہاں نئی نہ حریف پنجہ فگن نئے
وہی فطرتِ اسد اللّٰہی وہی مرحبی وہی عنتری

سب سے پہلا عنوان یہ ہے کہ انھیں مذہب سے متنفر یا بیگانہ بنایا جائے۔ تحریک آزادی کی قیادت آج ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں ہے جو خدا کا منکر ہے، مذہب کا دشمن ہے، روس کے الحاد و دہریت کا پرستار ہے، اس لیے وہ ہر جگہ یہی پرچار کرتا پھرتا ہے کہ غلامی اور محتاجی کی تمام مصیبتیں مذہب ہی کی پیدا کردہ ہیں، جب تک مذہب دفن نہیں ہوتا، "قوم" کو ہوش نہیں آ سکتا۔ اس کا اثر ظاہر ہے۔ ہزارہا نوجوان جو تحریک آزادی کے اس "قائد اعظم" کو اپنی امیدوں اور تمناؤں کا کعبۂ مقصود سمجھے بیٹھے ہیں مذہب کو علانیہ گالیاں دیتے پھرتے ہیں۔ جو ذرا ان سے متین ہیں یا یوں کہیے کہ جن میں جوانی کا جوش باقی نہیں رہا ہے وہ ہندوستانی پہلے اور مسلمان بعد ہونے کے مدعی ہیں۔ زیادہ صاف الفاظ میں وہ "بھارت ماتا پہلے اور خدا بعد کو" کا عقیدہ رکھتے ہیں، اور پھر بھی یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں۔ ان کے علاوہ جو لوگ مذہب کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ وہ بھی مذہب کے متعلق بس اتنا ہی سمجھتے ہیں کہ یہ عابد و معبود

کے درمیان ایک قلبی تعلق کا نام ہے۔ اس کو دنیاوی زندگی کے معاملات میں دخل انداز نہیں ہونا چاہیے۔ اور ایسا کہتے ہوئے وہ قطعاً محسوس نہیں کرتے کہ وہ اسلام سے کس قدر بُعد و بیگانگی کا اظہار کر رہے ہیں۔ یہ رو بڑھتی جا رہی ہے، اور اس سے تحریک وطن پرستی کے لیڈروں کا صاف منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس کھیتی میں ان کے پیش رو (انگریز) تخم ریزی کر چکے ہیں اسی کھیتی کی فصل یہ تیار کرنا اور کاٹنا چاہتے ہیں۔

آپ کہہ دیں گے کہ اس میں مسلمانوں کی کیا تخصیص ہے۔ اس قسم کا پروپیگنڈا ہندوؤں میں بھی تو ہو رہا ہے۔ اور ہندو نوجوان بھی تو اپنے مذہب سے متنفر ہوتے جا رہے ہیں پھر آخر ہندوؤں کو اس تحریک وطن پرستی کے خلاف وہ شکایت کیوں نہیں پیدا ہوتی جو تمہیں ہوتی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ "ہندو" کسی مذہب کا نام ہی نہیں ہے۔ وہ تو دراصل ایک نسلی قومیت کا نام ہے جو چند مخصوص قومی روایات کے زیر اثر صدہا برس سے پرورش پاتی رہی ہے اس نسلی قومیت کے دائرے میں خواہ کتنے ہی مختلف اور متضاد عقائد و اصول حیات داخل ہو جائیں اس کو کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے۔ بقول پنڈت جواہر لال نہرو کے:۔

"ہندومت کے دائرے میں بے حد مختلف اور متضاد خیالات اور رسوم داخل ہیں۔ اکثر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہندومت پر صحیح معنی میں لفظ مذہب کا اطلاق نہیں ہوتا ...... ممکن ہے کہ ایک شخص کھلم کھلا خدا کا منکر ہو (جیسے قدیم فلسفی چارواک تھے) لیکن کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ شخص ہندو نہیں رہا۔ جو لوگ ہندو گھرانوں میں پیدا ہوئے ہیں وہ چاہے کتنی ہی کوشش کریں، ہندومت ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ میں برہمن پیدا ہوا تھا اور برہمن ہی سمجھا جاتا ہوں چاہے مذہبی اور سماجی رسموں کے متعلق میرے خیالات اور میرے اعمال کچھ ہی ہوں" (ملاحظہ ہو پنڈت جی کی خود نوشت سوانح عمری ترجمہ اردو جلد اول صفحہ ۲۰۲ و ۲۰۳)۔

چونکہ ہندویت کی بنیاد کسی عقیدے اور کسی خاص نظام تہذیب و اصول حیات پر نہیں ہے، اس لئے وہ بیسیوں مختلف و متضاد مذہبی خیالات اور زندگی کے طور طریقوں کو اپنے دائرے میں لے چکی ہے اور پھر بھی "ہندویت" ہے، آئندہ بھی لے سکتی ہے اور پھر بھی ہندویت رہ سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ الحاد و دہریت اور اشتراکیت کے انتہائی انقلابی نظریات ——— اخلاقی، تمدنی، معاشی سب قسم کے نظریات ——— پھیلنے پر بھی ہندویت کے سخت سے سخت علمبرداروں تک کو کوئی اعتراض نہیں ہے، کیونکہ ان سب کے باوجود ان کی قومیت جوں کی توں برقرار رہتی ہے۔ بخلاف اس کے مسلمانوں کی قوم بنی ہی مذہب کے خمیر سے ہے۔ ایک عقیدہ کا اشتراک، ایک قسم کے طریقہائے عبادت کا اشتراک، ایک قسم کے اخلاقی تصورات کا اشتراک، ایک طرح کے ضابطۂ زندگی کا اشتراک، یہی سب چیزیں مل کر اس قوم کو ایک قوم بناتی ہیں ایک سرحدی پٹھان، ایک راجپوت، ایک جاٹ، ایک سندھی ایک بنگالی، ایک گجراتی، ایک مالا باری اور ایک مدراسی مسلمان کے درمیان کوئی رشتہ باقی ہی نہیں رہتا اگر اس مذہبی اشتراک کا رشتہ درمیان سے ٹوٹ جائے۔ اگر اعتقادات اسلامی سے وہ منکر ہو جائیں، اسلام کے اخلاقی اصول چھوڑ دیں، اسلامی زندگی کے بنیادی قواعد کی پابندی ترک کردیں، اور مذہبی اخوت و برادری کے تعلق کو منقطع کر کے معاشی طبقات میں تقسیم ہو جائیں اور آپس میں روٹیوں پر لڑنے لگیں تو سمجھ لیجیے کہ مسلمان قوم دفعۃً صفحۂ ہستی سے مٹ گئی، اور اس کے اجزا منتشر ہو کر مہا قوموں میں جذب ہو گئے۔

اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جو مسلمان کچھ عقل رکھتے ہیں، انھیں اس تحریک سے کیا خطرہ ہے؟ اور اب یہ بات بھی آپ کی سمجھ میں آسکتی ہے کہ وہ لاکھوں متعصب مہا سبھائی جن سے چند سال پہلے تک سارا ہندوستان بھرا ہوا نظر آتا تھا، دفعۃً کہاں غائب ہو گئے اور کیوں غائب ہو گئے۔ کوئی انتہا درجہ کا بے وقوف مہا سبھائی ہو گا جو اب اس "فرقہ وارانہ" جماعت یعنی مہا سبھا میں

شامل رہ کر اپنی پوزیشن خراب کرے گا۔ عقلمند مہا سبھائی جتنے تھے سب بفضل خدا جنگ آزادی میں شریک ہیں

آپ غور سے دیکھیں گے تو نظر آجائیگا کہ موجودہ تحریک گذشتہ تحریک یعنی انگریزی سامراج کی تحریک سے کہیں زیادہ گہری اور زود اثر ہے پہلی تحریک نے تو کہیں ڈیڑہ سو سال میں اتنا اثر کیا کہ کالجوں سے نکلنے والے صاحبزادوں کے دماغ ماؤف کر دیے لیکن اس تحریک کا اثر تو آپ کے بڑے بڑے قدامت پسند علماء تک پہنچ گیا ہے۔ ایمان کی قیمت و اہمیت کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان، اسلام کو تمام مذاہب سے افضل سمجھے اور نوعِ انسانی کی نجات وسعادت کا واحد اور آخری ذریعہ خیال کرے۔ اور یہ خیال محض خوش عقیدگی یا تعصب کی بنا پر نہیں، بلکہ از روئے قرآن حقیقت نفس الامری کی حیثیت سے ہو لیکن جب ایک مسلمان یہ کہنا شروع کر دے کہ دیگر مذاہب کی پابندی سے بھی اسی طرح نجات حاصل ہو سکتی ہے جس طرح اسلام کے اتباع سے تو یہ گویا اس بات کا اقرار ہے کہ مسلمان اگر مسلمان کی حیثیت سے نہ بھی زندہ رہے تو بھی کوئی مضایقہ نہیں وہ اگر غیر مسلم قوموں میں جذب ہو گیا تو نجات وسعادت سے محروم نہیں رہ سکتا۔ اس اعتراف کی زندہ شہادت مہاتما گاندھی کی وہ تقریر ہے جو انہوں نے چند سال ادھر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے ہال میں مسلمانوں کے اجتماع میں کی تھی انہوں نے فرمایا:—

"مجھے ایک عرصہ سے خیال تھا۔ کہ قرآن کبھی نجات وسعادت کے لیے اسلام ہی کو واحد ذریعہ قرار نہیں دے سکتا، بلکہ اس کی رو سے ہر مذہب کا انسان اپنے اپنے طریقہ پر کاربند رہ کر نجات حاصل کر سکتا ہے۔ مجھے اس کے ثبوت کی ضرورت تھی۔ آخر کار مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب "ترجمان القرآن" میں (جس کی پہلی جلد اس وقت شائع ہوئی تھی) اس بات کو ثابت کر دیا کہ میرا خیال صحیح ہے۔ چنانچہ ہم نے ترجمان القرآن کے ان حصوں کا

گجراتی زبان میں ترجمہ کر کے شائع کیا ہے"۔

آپ سمجھے بھی کہ یہ اتنے مشہور عالم دین امام الہند کی کس خدمت جلیلہ کا تذکرہ ہو رہا ہے؟ یہ وہ ذہنیت جو ایک مستقل مقصد کو سامنے رکھ کر مسلسل نشر و اشاعت کے ذریعہ سے ہندوستان بھر میں پھیلائی جا رہی ہے۔ اور اس کی سند مسلمانوں کے اتنے بڑے عالم سے حاصل ہو رہی ہے۔ مسلمان کو اس کے مذہب سے بیگانہ کرنے کے لیے۔ اس سے بڑھ کر اور کونسا حربہ کارگر ہو سکتا ہے۔ اور قیامت ہے کہ اس "جہاد عظیم" میں مسلمانوں کے اتنے بڑے بڑے نامور لوگ اس دلیری سے حصہ لے رہے ہیں۔

دوسرا مسئلہ روٹی کا ہے۔ اس باب میں انہیں کچھ زیادہ دشواری نہیں پیش آ رہی ہے۔ ان کے مورث ان کے لیے اس کھیتی کو بھی ڈیڑھ سو سال کی تخم ریزی و آب پاشی کے بعد بڑی حد تک تیار کر چکے ہیں۔ اب صرف فصل کاٹنے کی زحمت ہی ان کے لیے باقی ہے۔ دیوانی بنگال کی سند حاصل کرنے کے بعد سے انیسویں صدی کے آخر تک جس طرح مسلمانوں کو معاشی حیثیت سے تباہ و برباد کیا جاتا رہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس وقت مسلمان ہی ہندوستان کی سب سے زیادہ بھوکی قوم ہے۔ اور اس کی بھوک ہی کو ملحوظ رکھ کر یہ امید قائم کی گئی ہے کہ صدر کانگریس کی اشتراکی فوج میں سب سے بڑھ کر مسلمان حصہ لیں گے جو بھوک کے شکار ہیں اور جن کو جدید تعلیم نے اپنے مذہب سے بیگانہ، بلکہ ایک حد تک متنفر بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہماری قوم کے بہت سے اشتراکی نوجوان بے باکانہ کہتے پھرتے ہیں کہ کہاں کی تہذیب اور کیسی کلچر۔ سوال سارا دنیا میں پیٹ کا ہے جو اسی "بھوکی فوج" کے بل بوتے پر صدر کانگریس کو یہ کچھ کہنے کی جرأت ہو گئی ہے کہ میں کسی مخصوص تہذیب اور مخصوص تمدن کو نہیں جانتا۔ میں تو صرف دو باتیں جانتا ہوں: جمہور ہندوستانی اور ان کا افلاس۔ بے روزگار نوجوان ان الفاظ کو سن کر جوش مسرت سے دیوانہ ہو جاتا ہے۔ اور دل میں سمجھ لیتا ہے کہ بس

ہندوستان کی تمام مصیبتوں کا علاج اسی نظریہ میں ہے اور ان کا نجات دہندہ وہی ہے جو اس نظریہ کا پیش کرنے والا ہے۔ حالانکہ وہ ذرا غور سے دیکھے تو اسے نظر آجائے کہ ہندوستان کے یہ سب سے بڑے کمیونسٹ، یہ تمام انسانوں کو معاشی مساوات دیدینے کے حامی، یہ کہ جن کے دل گویا مفلسوں محتاجوں کی ہمدردی کے رستے ہوئے ناسور بن گئے ہیں، دراصل خود سرمایہ دار ہیں، زمیندار ہیں، کارخانہ دار ہیں، سودخوار ہیں، بورژوا ہیں، اور ان کی اشتراکیت محض اسٹیج کی اشتراکیت ہے جس کا مقصد محض بھولے نوجوانوں کو اپنے دام میں پھانسنا اور مسلمانوں کے درمیان الحاد اور طبقات کی جنگ برپا کرکے ان کی قومیت اور تہذیب دونوں کو ختم کردینا ہے۔ کلکتہ کی آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں اور کانپور و احمدآباد کی ہڑتالوں میں اور وزارت مدراس کی حمایت میں اس اشتراکیت کی حقیقت خوب ظاہر ہو چکی ہے۔

تیسرا مسئلہ زبان کا ہے۔ مسلمان عموماً اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور اس غلط فہمی میں انہیں اور زیادہ مبتلا کیا جا رہا ہے کہ زبان کا مسئلہ محض ایک ادبی اور تمدنی مسئلہ ہے۔ اس کا کوئی تعلق، کم از کم کوئی خاص تعلق کسی قوم کے مذہب اور تہذیب سے نہیں ہے لیکن یہ خیال جس قدر جلدی دور ہو جائے اتنا ہی بہتر ہے۔ قومیت کو بنانے اور بگاڑنے میں، تہذیب کو زندہ رکھنے اور فنا کردینے میں، قومیت کا مذہب سے تعلق باقی رکھنے اور منقطع کردینے میں زبان کا اثر غیر معمولی ہے۔ جس قوم کے پاس اپنی زبان اور اپنا رسم الخط ہے وہ ایک مستقل قوم ہے اور جس قوم کی زبان میں خود اپنا لٹریچر موجود ہے اور ترقی کررہا ہے وہ ایک زندہ قوم ہے۔ جس وقت وہ اپنی زبان و رسم الخط کو بدل دینے پر آمادہ ہو جائے اس وقت سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اپنی قومیت کو بدل رہی ہے اور اپنی تہذیب سے رشتہ منقطع کر رہی ہے۔ اس باب میں اگر کوئی شہادت آپ کو درکار ہو تو میں پنڈت جواہر لال نہرو ہی کو گواہوں کے کٹہرے

میں لاکر کھڑا کرونگا۔ وہ اپنے ایک تازہ مضمون میں فرماتے ہیں:-

"ایک قوم کے لیے زبان کا مسئلہ ہمیشہ بڑا اہم رہا ہے۔ آج سے تین سو برس پہلے ملٹن نے فلورنس سے ایک دوست کو خط لکھتے ہوئے اس کی اہمیت کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا۔ کسی قوم کے اپنی ایک زبان رکھنے کو، خواہ وہ زبان بگڑی ہوئی ہو یا خالص ہو، ایک غیر اہم سا واقعہ نہ سمجھ لینا چاہیے، اور نہ اس امر کو کہ اس کے افراد زبان کے برتنے میں صحت کا کہاں تک لحاظ رکھتے ہیں۔ .... کوئی تاریخی شہادت ایسی نہیں ملتی کہ کوئی سلطنت یا مملکت اس وقت تک اوسط درجے کی خوشحالی و فلاح سے محروم کردی جاسکتی ہو جب وقت تک کہ اس کے افراد اپنی زبان کو پسند کرتے اور اسکی طرف کافی توجہ کرتے رہے ہوں"۔

ایک دوسری جگہ پنڈت جی فرماتے ہیں۔

"رسم الخط کا اور ادب کا بہت ہی گہرا تعلق ہے اور رسم الخط کی تبدیلی اس زبان کے لیے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے جس کا ماضی شاندار رہا ہو۔ رسم الخط بدلنے کے ساتھ الفاظ کی شکلیں بدل جاتی ہیں، آوازیں بدل جاتی ہیں، اور خیالات بدل جاتے ہیں۔ قدیم اور جدید ادب کے درمیان ایک ناقابل عبور دیوار حائل ہوجاتی ہے اور قدیم ادب ایک ایسی اجنبی زبان کا ادب بن کر رہ جاتا ہے جو مردہ ہوچکی ہے" (میری کہانی۔ جلد اول ص ۲۹۵)

اگرچہ زبان اور رسم الخط کی اہمیت پر بہت سی ایسی شہادتیں بھی نقل کی جاسکتی ہیں جو علمی حیثیت سے نسبتہً زیادہ وقیع ہیں۔ مگر میں نے قصداً یہ شہادت اس لیئے نقل کی ہے کہ آگے چل کر ہندوستان کی زبان کے متعلق انہی جواہر لال اور انہی کے ہم خیال معماران وطن کی جن کارگذاریوں کا ذکر میں کرنا

چاہتا ہوں ان کو پڑھتے وقت ناظرین کو یہ معلوم رہے کہ یہ لوگ زبان اور رسم الخط کی اہمیت سے ناواقف نہیں ہیں بلکہ اس کا پورا شعور رکھتے ہیں، اور خوب سوچ سمجھ کر وہ طرزِ عمل اختیار کر رہے ہیں جس کی تشریح میں آگے کرنے والا ہوں۔

اردو زبان اگرچہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے پیدا ہوئی ہے، ان دونوں قوموں کے سیاسی و تمدنی وفاق کا ایک بڑا ذریعہ ہے، ان کے درمیان باہمی مفاہمت کا بہترین وسیلہ رہی ہے اور بن سکتی ہے، اور اس لحاظ سے ہندوستان کے آئندہ سیاسی ارتقا کی شکل کو بنانے یا بگاڑنے میں اس زبان کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے، لیکن یہ ایک بڑی غلطی ہوگی اگر ہم اس کی اہمیت کو صرف اسی حد تک محدود رکھیں۔ ہندوؤں کے لیے اس زبان کی زندگی و موت ان کی قومیت اور ان کی تہذیب کی زندگی و موت کا حکم نہیں رکھتی۔ شمالی ہند میں ان کی ایک بڑی تعداد اس کو بولتی اور لکھتی پڑھتی ہے، مگر ان کی قومیت اور تہذیب کے لیے زندگی کا صرف یہی ایک سہارا نہیں ہے۔ بخلاف اس کے مسلمانوں کے لیے ہندوستان میں صرف یہی ایک زبان ہے جس کی بدولت ان کی قومیت اور ان کی تہذیب زندہ ہے اور رہ سکتی ہے۔ یہی زبان تمام اقطاعِ ہند کے مسلمانوں میں وحدت قائم کرتی ہے۔ اسی زبان کے ذریعہ سے مسلمانوں کا تعلق اپنے ماضی کیسا قائم رہتا ہے۔ اسی زبان کا رسم الخط ان کو قرآن کے رسم الخط سے قریب تر رکھتا ہے۔ اسی زبان میں وہ الفاظ اور اسالیبِ بیان پیدا ہو گئے ہیں جو اسلامی خیالات کو ادا کرنے کے لیے مناسب ہیں، اور جن کے ذریعہ سے بولنے والوں اور سننے والوں میں اسلامی ذہنیت پیدا ہوتی ہے۔ عربی زبان کے بعد دنیا میں کوئی زبان ایسی نہیں ہے جس میں اسلام، اس کی تاریخ اور تہذیب کے متعلق اتنا لٹریچر موجود ہو جتنا اس زبان میں ہے۔ قلیل التعداد عربی دانوں کے سوا مسلمانانِ ہند کی عظیم اکثریت کے لیے اس لٹریچر سے واقف ہونے کا صرف یہی ایک ذریعہ ہے۔ اگر یہ زبان بدل جائے یا اس کے الفاظ

اور اسالیب بیان بدل جائیں یا اس کا رسم الخط بدل جائے تو مسلمان اس ملک میں بحیثیت ایک قوم کے باقی نہیں رہ سکتے جس طرح چین میں باہر سے متعدد قومیں فاتحانہ داخل ہوئیں اور وہاں کی زبان اور معاشرت کو اختیار کرکے چینی قوم میں ایسی جذب ہوئیں کہ آج ان کا نام و نشان تک نظر نہیں آتا، جس طرح ہندوستان میں مسلمانوں سے پہلے بہت سی قومیں آئیں اور یہاں کی زبان و معاشرت اختیار کرکے اپنے قومی وجود کو کھو بیٹھیں، اسی طرح اگر مسلمان بھی اردو زبان کو کھو دیں تو یہ گویا ہندوستان کی کان نمک میں ان کے نمک بن جانے کا سب سے بڑا ذریعہ ہوگا ــــ اردو کی یہ اہمیت مسلمانوں کے سوا ہندوستان کی کسی دوسری قوم کے لیے نہیں ہے۔ دوسری قوموں کے لیے یہ محض اظہار خیال کا ایک اچھا ذریعہ ہے۔ مگر اس کو چھوڑ کر بھی وہ اپنے قومی وجود کو برقرار رکھ سکتی ہیں۔

ان تمہیدی گذارشات کو نظر میں رکھیے اور اس کے بعد دیکھیے کہ زبان کے مسئلہ سے سیاسی اغراض کے لیے کیا کام لیا گیا ہے اور اب کیا کام لیا جا رہا ہے۔

ہمارے غیر ملکی حکمرانوں نے انگریزی زبان کو سرکاری زبان اور ذریعہ تعلیم قرار دیکر "خوشنما ضرب" (Master stroke) لگائی تھی اس کا اثر آپ دیکھ چکے ہیں۔ انہوں نے غلاموں کی زبان (ورناکیولر) کو مٹایا نہیں۔ اسے بدلنے کی کوئی کوشش نہیں کی اس کو زندہ رہنے کا حق بالکل اسی طرح عطا کر دیا جس طرح کراچی کے ریزولیوشن میں "بنیادی حقوق" کے سلسلہ میں عطا کیا گیا ہے۔ انہوں نے بس اتنا کیا کہ ذریعہ تعلیم بدل دیا اور صرف اس زبان کے جاننے والوں کے لیے ترقی کے دروازے بند کر دیے۔ سو سال کی مدت کسی قوم کی زندگی میں کوئی بڑی مدت نہیں ہوتی مگر آپ دیکھیے کہ صرف سو ہی سال کے اندر اس پالیسی کا کیا انجام ہوا ہے۔ ہم انگریزی پر ٹوٹ پڑے ہمارے تعلیم یافتہ لوگ اپنی زبان سے، اور اس کے ساتھ اپنے ماضی سے، اپنی قومی روایات سے اپنے لٹریچر سے، اپنی تہذیب و تمدن سے اور اپنے خیالات کے خزانوں سے بیگانہ ہوتے چلے گئے

انگریزی زبان اپنے ساتھ ایک غیر قوم کے خیالات بھی لیے ہوئے ان کے دل و دماغ میں گھستی چلی گئی، اور اس نے ان کو اندر سے بدلنا شروع کیا، یہاں تک کہ وہی مقصد تقریباً حاصل ہو گیا جس کو پیش نظر رکھ کر میکالے اور اس کے ہم خیال لوگوں نے یہ شاہ ضرب لگائی تھی یعنی اس زبان کے ذریعہ سے ایک ایسی قوم پیدا ہو گی جو رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی ہو گی مگر روح کے اعتبار سے انگریز ہو جائیگی۔

"ہندوستانی قومیت" کے معمار بھی انہی استادوں کے شاگرد ہیں۔ انہوں نے قومیت کو بنانے اور بگاڑنے کی تدبیریں انہی سے سیکھی ہیں۔ ان کے استاد اور مورث جس کھیتی کو گذشتہ سو برس سے تیار کرتے رہے ہیں اسی کی فصل اب یہ کاٹنا چاہتے ہیں، اور چونکہ یہ غیر ملکی نہیں ہیں، اسی ملک کے لوگ ہیں لہذا ان کے لیے وہ انقلاب برپا کرنا زیادہ آسان ہے، جس کی جرأت ان کے استاد نہیں کر سکتے اس لیے کہ وطن کی مشترک فلاح وبہبود چاہنے والے "قوم پرست" بن کر یہ سب کچھ کر سکتے ہیں خود ہماری قوم کے لوگوں کو فریب میں مبتلا کر سکتے ہیں، اور کوئی ان کو ٹوکنے کی جرأت نہیں کر سکتا، تا وقتیکہ اس میں "ٹوڈی" اور "رجعت پسند" اور "سامراج پرست" کے گھناؤنے القاب سننے کی جرأت نہ ہو۔

آزادی ہند کے سب سے بڑے علمبردار مہاتما گاندھی جی اس تحریک کے بھی سب سے بڑے علمبردار ہیں جس کا مقصد ہندی کو دیوناگری رسم الخط کے ساتھ ہندوستان کی "قومی زبان" بنانا ہے۔ وہ اور ان کے مددگار ـــــ جو سب کے سب جنگ آزادی کے جنرل ہیں ـــــ اپنے تمام اثر اور قوت کو اس کام کے لیے استعمال کر رہے ہیں جو انھیں ہندوستان کی مشترک فلاح وبہبود کے لیے جدوجہد کرنے والے "مجاہدین حریت" ہونے کی حیثیت سے حاصل ہوتا ہے۔ خدانخواستہ ان کا مقصد یہ نہیں کہ اردو زبان اور اس کے رسم الخط کو مٹائیں۔ ان کا مقصد تو صرف یہ ہے ـــــ اور یہ بالکل پاک مقصد ہے ـــــ کہ ہندی زبان کو دیوناگری رسم الخط کے ساتھ ہندوستان کی "قومی زبان"

بنا دیں۔ اگر اس کا نتیجہ عملاً وہی ہو جو اردو زبان کو مٹانے کی کوشش کا ہو سکتا ہے تو کوئی حرج نہیں اس لیے کہ کانگریس کے شعبۂ اسلامیات کے معتمد ڈاکٹر محمد اشرف صاحب ہم کو اپنے ایک سرکاری کمیونک میں یقین دلا رہے ہیں کہ گاندھی جی کو ایسا کرنے کا پورا حق ہے اور ان کا یہ فعل "فرقہ پرستی" نہیں ہے۔ ہاں اس کے مقابلہ میں کچھ کہنا ضرور "فرقہ پرستی" ہے!

گاندھی جی کا خیال یہ ہے کہ ہندی زبان ہی ہندوستان کی قومی زبان ہے اور دیوناگری رسم الخط ہی ہندوستان کا رسم الخط ہونا چاہیے۔ ("ہریجن" بحوالہ ٹریبیون مورخہ ۸ جولائی ۱۹۳۷ء) مگر یہ بات وہ ہندو "فرقہ پرست" ہونے کی حیثیت سے نہیں کہتے، اور نہ اس میں وہ رجحان پایا جاتا ہے جسے پنڈت جواہر لال اپنے ایک تازہ مضمون میں "علیحدگی پسندی کے رجحان" (Separatist tendency) سے تعبیر کرتے ہیں۔ بلکہ ان کا خیال یہ ہے کہ ہندوستان میں ہندو، مسلمان اور دوسری قوموں کو ملا کر جو قوم بنانا پیشِ نظر ہے اس کی زبان ہندی ہو اور رسم الخط ہندوستانی۔ اسی مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر انہوں نے وہ طریق کار اختیار کیا ہے جو ایک "ٹھیٹھ قوم پرست" کو اختیار کرنا چاہیے۔ وہ جب کانگریس میں تشریف لاتے ہیں تو ہندوستان کی مشترک "قومی زبان" کا نام "ہندوستانی" رکھتے ہیں جس کے دو رسم الخط ہیں یعنی فارسی اور دیوناگری، اور یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ان دونوں رسم الخطوں کے ساتھ "ہندوستانی" کو سرکاری زبان ہونا چاہیے۔ مگر جب ہندی سمیلن میں تشریف لے جاتے ہیں تو اسی قومی زبان کا نام "ہندی" ہو جاتا ہے اور اس کے دو رسم الخط یعنی فارسی اور دیوناگری قرار پاتے ہیں۔ مدراس میں ہندی سمیلن کا جو اجلاس ہوا تھا اس میں گاندھی جی نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"صرف ہندی زبان ہی جس کا بعد میں جا کر دوسرا نام ہندوستانی اور اردو بھی پڑ گیا، اور جو دیوناگری اور اردو رسم الخط میں لکھی جاتی ہے، اس کی صلاحیت تھی اور ہے کہ وہ

ہمارے ملک کی مشترک زبان قرار دی جائے" (ملاحظہ ہو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے شعبۂ اطلاعات سیاسی و معیشی کا کمیونک)

اسی رجحان کے تحت "ہندی ہندوستانی" کی اصطلاح وضع کی گئی اور پھر اس کا نام "ہندی اتھوا ہندوستانی" (ہندی یعنی ہندوستانی) ہوگیا۔

ایک دوسرے موقع پر بھارتیہ ساھتیہ پریشد (وفاق ادبیات ہند) کے اجلاس منعقدہ مدراس میں گاندھی جی نے جو تقریر فرمائی اس کے حسب ذیل فقرے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے شعبۂ اطلاعات سیاسی و معیشی کے سرکاری بیان سے نقل کیے جاتے ہیں جن سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ "فرقہ پرستی" کے برخلاف "قوم پرستی" کس طرح کام کرتی ہے:۔

"میں نے آج نہیں بلکہ ۱۹۱۸ء میں ہندی ساہتیہ سمیلن کے صدر کی حیثیت سے ہندی بولنے والی دنیا کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ ہم لوگ ہندی کے مفہوم کو اتنا وسیع کر دیں کہ اس کی تعریف میں اردو آجائے۔ جب ۱۹۳۵ء میں میں نے دوسری بار سمیلن کی صدارت کی تو میں نے "ہندی" اصطلاح کی باضابطہ طور پر اس طرح تعریف کی کہ ہندی اس زبان کا نام ہے جسے ہندو اور مسلمان دونوں بولتے ہیں اور جو اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ اس توضیح سے میرا منشا یہ تھا کہ ہندی زبان بیک وقت مولانا شبلی کی فصیح و بلیغ اردو، اور پنڈت شیام سندر داس کی فصیح و بلیغ ہندی پر مشتمل ہو۔"

"اس کے بعد بھارتیہ ساہتیہ پریشد کا زمانہ لیجیے جو ہندی سمیلن کی ضمنی تحریک ہے۔ اس کے اجلاس میں میری سفارش پر ہندی کے بجائے ہندی ہندوستانی کی اصطلاح اختیار کی گئی۔ مولوی عبدالحق صاحب نے اس اجلاس میں میری پرزور مخالفت کی، مگر میں ان کی تجویز نہ ماننے کے لیے مجبور تھا۔ اگر مولوی صاحب کی تجویز کے مطابق میں ہندی

کے لفظ کو نکال دیتا تو یہ میرے اور سمیلن کے اوپر ظلم تھا۔ اس لیے کہ یہ لفظ ہندی سمیلن والوں کا دیا ہوا تھا اور وہ میری سفارش پر ہندی کی تعریف میں اردو کو داخل کر چکے تھے۔ اس بات کو بھی ذہن میں رکھیے کہ "ہندی" لفظ کچھ ہندوؤں کی اختراع نہیں ہے یہ نام مسلمانوں کی آمد کے بعد پڑا ہے اور اس سے مراد وہ زبان ہے جو اس وقت شمالی ہند کے ہندو مسلمان بولتے اور لکھتے پڑھتے تھے۔ لاتعداد مشہور و معروف مسلمان مصنفوں نے اپنی مادری زبان کو "ہندی" نام سے یاد کیا ہے۔ پھر اب جبکہ ہندی زبان کی حد بندی میں ہندو اور مسلمان دونوں کی ہر قسم کی تحریری اور تقریری زبان شامل ہے تو لفظوں کے اختلاف پر یہ ہنگامہ اور غوغا کیوں ہے؟

اس بحث کا ایک پہلو اور بھی سوچنے کے قابل ہے۔ جہاں تک جنوبی ہند کی زبانوں کا تعلق ہے، وہ صرف ایسی ہندی سے لگاؤ رکھ سکتی ہیں جس میں سنسکرت کے الفاظ کی ملاوٹ ہو اس لیے کہ یہ زبانیں سنسکرت کے بعض الفاظ اور سنسکرت آوازوں سے مانوس ہیں۔"

اب آپ کے سامنے ہندوستان کی "قومی زبان" کے ارتقاء کا وہ پورا نقشہ آجاتا ہے جو "قومیت ہند" کے اس معمار اعظم کے پیش نظر ہے۔ اس نقشہ کے مطابق:۔

پہلا مرحلہ یہ ہے کہ "ہندی" کے دامن کو پھیلا کر "اردو" کو اس میں سمیٹ لیا جائے۔ اردو کے علیحدہ نام سے جو امتیاز ان دونوں زبانوں میں پیدا ہوتا ہے وہ محض ذرا سے تبدیل نام کے ساتھ مٹا دیا جائے اور ان دونوں کو ملا کر ایک نام "ہندی" سے موسوم کیا جائے تاکہ یہ تخیل زندہ نہ رہ سکے کہ یہ دو الگ زبانیں ہیں۔ (اس مقصد کے لیے اس تاریخی واقعہ سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ قدیم زمانہ میں مسلمانوں نے "اردو" کو "ہندی" کے نام سے موسوم کیا تھا

حالانکہ یہ پرانا واقعہ زمانہ حال کی اس حقیقت پر کوئی اثر نہیں ڈالتا کہ اس وقت یہ دو زبانیں دو الگ ناموں اور الگ رسم الخطوں کے ساتھ دو مستقل زبانیں ہیں۔)

دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ جنوبی ہند کی زبانوں سے تعلق پیدا کرنے کی خاطر اردو کو آہستہ آہستہ ہندی کے قریب لایا جائے۔ اس میں ہندی اسالیب بیان سنسکرت الفاظ اور سنسکرت آوازیں پیدا کی جائیں اور اس طرح وہ ہندی" کا دامن اردو کو ساتھ لیے ہوئے سکڑنا شروع ہو، یہاں تک کہ وہ اپنے اسالیب بیان اور اپنے ذخیرۂ الفاظ اور آوازوں کی حد تک کوئی علیحدہ زبان نہ رہے بلکہ ہندی کے وجود میں تحلیل ہو کر رہ جائے۔

تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ جب اردو اس طور پر ہندی میں تحلیل ہو جائے تو رفتہ رفتہ رسم الخط کے امتیاز کو بھی دور کر دیا جائے۔ سردست رسم الخط کو بدلنے کی ضرورت نہیں۔ کراچی ریڈیو اسٹیشن کے کھلونے سے اردو والے دل بہلاتے رہیں، "حب قوم پرستی" بڑھے گی اور اس کے اثر سے زبان کے الفاظ اور آوازوں میں تغیر پیدا ہوگا تو آہستہ آہستہ رسم الخط خود بدل جائے گا۔

ان تینوں مرحلوں کو اگر آپ ایک مثال کے ذریعہ سے سمجھنا چاہتے ہیں تو یوں سمجھیے کہ پہلے عبداللہ کا نام پرمیشری داس رکھ دیا جائے۔ جب وہ اس پر کان کھڑے کرے تو اس سے کہا جائے کہ میاں محض لفظوں کے اختلاف پر ہنگامہ اور غوغا کیوں برپا کرتے ہو؟ پرمیشری داس کے معنی بھی تو وہی ہیں جو عبداللہ کے ہیں۔ صرف الفاظ ہی تو بدلتے ہیں معنی میں تو کوئی فرق نہیں آتا۔ جب وہ اس طرح سمجھانے پر مان جائے تو پھر اسے یہ سمجھایا جائے کہ بھائی پرمیشری داس ذرا سر پر چوٹی رکھ لو، کبھی کبھی دھوتی باندھ لیا کرو، اپنا یہی بھوجن جو تم کھاتے ہو پتل پر رکھ کر کھانے لگو۔ اس میں کوئی حرج تو ہے نہیں۔ اور فائدہ یہ ہے کہ کروڑوں کی آبادی جس کے ساتھ تمہارا رہنا سہنا اور مرنا جینا ہے، اس سے تمہاری اجنبیت دور ہو جائے گی۔ جب پرمیشری داس صاحب اتنے معقول

تجویز کو بھی مان لیں تو پھر ان کو زیادہ نہ چھیڑو۔ آہستہ آہستہ اسی راستہ پر انھیں بڑھنے دو۔ اگر وہ نہیں تو ان کے صاحبزادے دھرم چند (جو شائد پہلے قمر الدین ہوتے) یا ان کے پوتے رام پیارے (جو حبیب اللہ ہوتے اگر یہ چال نہ چلی جاتی) خود بخود شدھ پیدا ہوں گے۔ بغیر اس کے کہ ان کی شدھی کے لیے سنکراچاریہ آف شاردھا پیٹھ کی مدد حاصل کی جائے ــــ ہندوستان میں ایک متحدہ قومیت پیدا کرنے کی اس سے بہتر تدبیر اور کیا ہو سکتی ہے؟

مہاتما گاندھی کے کارنامے کی روداد ختم کرنے سے پہلے میں اُس "ہندی" (یعنی ہندی اور اردو کے مرکب) کا ایک نمونہ بھی پیش کردوں جس میں مہاتما جی کے بقول "یہ صلاحیت تھی اور ہے کہ وہ ہمارے ملک کی مشترک زبان قرار دی جائے۔ بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے اجلاس ناگپور منعقدہ ۲۴ اپریل ۱۹۳۵ء کی صدارت کرتے ہوئے انہوں نے جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا اس کے ابتدائی فقرے یہ ہیں:۔

"اس سبھا کا سبھا پتی تو مجھے دینے کا کارن جب میں ڈھونڈتا ہوں تو دو ہی پرتیت ہوتے ہیں۔ ایک میرے ساہتیہ کار نہ ہونا اور اس لیے کم سے کم دویش کا کارن ہونا۔ تھا دوسرا میرا ہندوستان کی سب بھاشاؤں کا پریم۔ جو کچھ ہو، میں آشا کرتا ہوں کہ ہم کچھ نہ کچھ سیوا کریں گے اور بھوشیہ میں اپنا سیوا اکشیتر بڑھاویں گے۔ یدی ہم سری نگر سے لیکر کنیا کماری تک اور کراچی سے لیکر ڈبروگڑھ تک جو پردیش ہے اسے ایک مانتے ہیں اور اس کے لوگوں کو ایک پرجا سمجھتے ہیں تو اس پردیش کے پرتیک بھاگ کے ساہتیہ کار بھاشا شاستری اتیادی آپس میں کیوں نہ ملیں اور بعض بعض بھاشاؤں دوارا ہندوستان کی تپھالوگیہ سیوا کیوں نہ کریں۔ (رسالہ جامعہ مورخہ مئی ۱۹۳۶ء)

یہ ہے وہ "ہندی" جس کا مفہوم اتنا وسیع ہے کہ "اردو" اس کی تعریف میں آجاتی ہے۔ (باقی)

اطلاع

سررشتہ تعلیمات سرکار آصفیہ کی جانب سے ہر سال ترجمان القرآن کے جو ڈھائی سو پرچے مدارس کے لیے خریدے جاتے تھے اُن کو ماہ شوال ۵۶ سنہ سے گھٹا کر (۱۱۸) کر دیا گیا ہے لہذا جن مدارس وسطانیہ و تحتانیہ کو آئندہ مہینہ سے پرچہ نہ پہنچے انھیں یاددہانی کی زحمت نہ اٹھانی چاہیے۔

جو مدارس آئندہ اس رسالہ کی خریداری جاری رکھنا چاہیں وہ اپنے بجٹ سے پرچہ خرید سکتے ہیں۔

منیجر

اطلاع ثانی

ماہ ذی القعدہ ۵۶ سنہ میں رسالہ ترجمان القرآن کا دفتر حیدرآباد سے جمال پور ضلع گورداسپور (پنجاب) میں منتقل ہو جائے گا۔ صرف ماہ شوال کا پرچہ حیدرآباد سے شائع ہو گا۔ لہذا ممالک محروسہ سرکار نظام کے اضلاع میں جو اصحاب اس رسالہ کے خریدار ہیں وہ براہِ کرم دفتر کو مطلع فرما دیں کہ ان کا پرچہ کس مقام کے انگریزی ڈاک خانہ کی معرفت بھیجا جائے۔

منیجر

مشہور مستشرق ڈاکٹر گستاولی بان کی شہرۂ آفاق تصنیف

تمدّن عرب

جو

مدتوں سے نایاب تھی پہلے ایڈیشن ۱۸۹۸ء کی صفحہ بہ صفحہ جامع خصوصیات کے علاوہ
نواب جیون یار جنگ بہادر بی. اے بیرسٹرایٹ لا منصرم چیف جسٹس ہائی کورٹ حیدرآباد دکن کے

عالمانہ، مبصرانہ، ناقدانہ، مقدمہ اور فاضل مترجم

شمس العلماء ڈاکٹر سید علی بلگرامی

مرحوم کے جامع سوانح کے ساتھ نیز (۵) رنگین (۱۳۷) سادہ تصاویر (۳) نقشوں کے ہمراہ
جس کی قیمت پچاس روپے تھی مگر سو روپیے میں بھی نہیں مل سکتی تھی۔ اب

اعلیحضرت فرمانروائے دکن مدظلہ

کے جشن سیمیں کی شادمانی میں اعظم اسٹیم پریس کی جانب سے شائع ہوچکی ہے
قیمت صرف پچیس روپیے سنہری جلد خرچ ڈاک وغیرہ بذمہ خریدار

عبدالقادر

پبلیشر گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹر و پرپرائٹر اعظم اسٹیم پریس چارمینار
حیدرآباد دکن
مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس چارمینار حیدرآباد دکن